تعمیر حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

عالِم وہ ہے جو خدا سے ڈرے

حضرت شعبیؒ سے کہا گیا: اے عالم! مجھے مسئلہ بتادے، تو انھوں نے فرمایا، عالم تو وہ ہے جو خدا سے ڈرے۔

اگر علماء علم کی حفاظت کرتے اور مستحقین علم کو ہی علم عطا کرتے تو اپنے زمانہ کے مقتدیٰ ہوتے لیکن انھوں نے علم کو دنیا داروں پر ان سے دنیا حاصل کرنے کے لئے لگایا تو وہ دنیا والوں کی نظر میں حقیر ہوگئے۔

(عبد اللہ بن مسعودؓ)

عالم جب اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو اس کے وعظ و نصیحت کا بھی دل پر اثر نہیں ہوتا جس طرح پانی کا چٹان پر اثر نہیں ہوتا۔

علماء لوگوں کے لئے باعثِ تسکین ہوا کرتے تھے۔ جب مریض ان کو دیکھتا تو اس کو تندرست ہونے کی تمنا و خواہش نہیں ہوتی اور جب فقیر کی نظر ان پر پڑتی ہے تو اس کو مالدار ہونے کی خواہش نہ ہوتی۔ لیکن اب وہ لوگوں کے لئے فتنہ بنے ہوئے ہیں۔

(فضیل بن عیاض)

حضرت خالد بن صفوان سے حضرت حسن بصری کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: آپ کا ظاہر و باطن بالکل یکساں تھا، جس کا دوسروں کو حکم دیتے اس پر خود عمل کرتے۔

(کیا بے مثال شخص تھے، لوگوں کے مال و دولت سے بالکل بے نیاز اور حصول دین کے لئے لوگ ان کے محتاج)۔

حضرت احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے عبد اللہ نے اپنے والد امام احمد بن حنبلؒ سے کہا کہ یہ شافعی کون شخص ہیں؟ میں نے آپ کو ان کے لئے بہت دعائیں کرتے سُنا ہے تو انھوں نے فرمایا: اے بیٹے! امام شافعی ایسے شخص تھے جیسے دنیا کے لئے سورج اور جیسے بدن کے لئے عافیت، کیا ان دونوں چیزوں کا کوئی بدل یا عوض ہوسکتا ہے؟

فی کاپی: ایک روپیہ

سالانہ چندہ: بیس روپے

۱۰ر نومبر ۱۹۸۲ء

تعمیرِ حیات لکھنؤ

ہفت روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

زرِ تعاون!

اندرون ملک ..... فی پرچہ ..... ایک روپیہ

بیرون ملک بحری ڈاک چندہ سالانہ ..... ۵۰ روپے

ہوائی ڈاک

پاکستانی ممالک ..... ۶۰ روپے

افریقی ممالک ..... ۸۰ روپے

یورپ و ایشیا ..... ۱۰۰ روپے

جلد نمبر ۲۰ | ۱۰ر نومبر ۱۹۸۲ء | ۲۳ر محرم الحرام ۱۴۰۳ھ | شمارہ نمبر ۱

اداریہ

محمد رابع حسنی ندوی

ماسٹر محمد سمیع صدیقی رحمۃ اللہ علیہ

دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک پرانے اور مقتدر استاذ جناب ماسٹر محمد سمیع صدیقی صاحب نے ۱۹ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کو رس بجے شب میں اس دار فانی سے دار باقی کو رحلت کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ماسٹر صاحب ندوۃ العلماء میں ۵۶ سال قبل انگریزی زبان کے استاذ کی حیثیت سے آئے اور اس وقت سے ابتک اپنی علمی و تعلیمی صلاحیت سے دار العلوم کو فائدہ پہونچاتے رہے، اس مدت میں دار العلوم میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تین چار نسلوں نے ان سے فائدہ اٹھایا، اور ان کو یہاں طلبہ اور اسٹاف میں بڑی قربت و مقبولیت حاصل رہی۔

ماسٹر صاحب کی یہ مقبولیت محض بڑی تعداد کے استاد ہونے کی وجہ سے ہی نہ تھی بلکہ اس میں ماسٹر صاحب مرحوم کا وہ اخلاق اور ان کی وہ شفقت ایک بڑا سبب تھی جو ان کی طرف سے اپنے اہل تعلق اور شاگردوں کے ساتھ رہتا تھا، وہ طلباء کو بڑی محبت اور دلسوزی سے پڑھاتے اور جب تک پڑھانے کا وقت اور موقع رہتا یکساں توجہ و جذبہ سے افادہ و تعلیم میں منہمک رہتے، وہ اپنے شاگردوں کو بھی متوجہ رہنے پر مجبور کرتے، نہ خود بے توجہی کرتے اور نہ شاگردوں کی بے توجہی برداشت کرتے، طلباء کے ساتھ ان کی مزید عنایات یہ رہتیں کہ جو طلباء راستہ چلتے ان سے استفادہ کے طالب ہوجاتے یا ان کی قیام گاہ پر وقت ناوقت پہونچ جاتے ان کے ساتھ بھی بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے اور ان کی مطلوبہ غرض پوری فرماتے۔

ماسٹر صاحب کا تدریسی زمانہ نوعمری ہی سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں گذرا دار العلوم کی مسجد کے متصل مغربی پہلو میں ان کو شروع سے ایک قطعہ زمین حاصل ہوگیا تھا جس میں ایک متوسط سطح کا مکان بھی ماسٹر صاحب نے تعمیر کرلیا تھا، اس طرح پر دار العلوم ندوۃ العلماء سے ان کو رہائشی قرب بھی حاصل رہا، اس کی بناء پر ندوہ نہ صرف ان کی مشغولیت کا مرکز تھا بلکہ محلہ اور وطن بھی بن گیا تھا، اس قرب کا یہ اثر پڑا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماحول سے ماسٹر صاحب کو والہانہ تعلق پیدا ہوگیا تھا، وہ جہاں بھی جاتے دار العلوم ندوۃ العلماء یاد آتا، اور اس طرح واپس آتے جیسے اپنے گھر آئے، تقسیم ہند کے بعد ان کے اعزہ نے بہت چاہا کہ وہ پاکستان منتقل ہوجائیں لیکن ماسٹر صاحب نے ندوہ کی مسجد اور اس کے ماحول کا بہانہ کیا، ندوہ سے ماسٹر صاحب کے اس والہانہ تعلق کا اثر ان کے صاحبزادگان پر بھی پڑا وہ بھی ندوہ سے وطنی تعلق محسوس کرنے لگے، چنانچہ ماسٹر صاحب کے ایک صاحبزادہ ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی نے جو نیویارک میں پریکٹس کرتے ہیں، وہاں نیویارک میں اپنے خرید کردہ مکان کا نام ندوہ رکھا ہے اور وہاں کے ڈاک خانہ میں بھی یہ نام رجسٹرڈ کرادیا ہے۔

ندوہ سے ماسٹر صاحب کا یہ تعلق ان کی دینداری اور دین سے جذباتی تعلق کی بنا پر بھی تھا، انھوں نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کا عہد پایا تھا اور ان کے فیض صحبت سے بھی فائدہ اٹھایا، سابق ناظم مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب حسنیؒ سے قریبی تعلق و ربط رہا، انھوں نے اسلامی کتابوں کا اچھا مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کا اثر ان کی علمی دلچسپیوں اور خیالات میں نمایاں تھا۔ نماز باجماعت کے بڑے پابند اور مشرقی و اسلامی آداب پر ثابت قدم تھے۔

ماسٹر صاحب کا مضمون اگرچہ انگریزی تھا، اسی کو پڑھایا اور اس میں کمال پیدا کیا اور اس سے ان کی وابستگی ایسے زمانہ میں شروع ہوئی تھی جس زمانہ میں کثر لوگ انگریزی فکر و ثقافت سے متاثر ہونے سے بچتے تھے، لیکن ماسٹر صاحب کو دیکھ کر ان کے اسلامی خیالات کی پختگی جان کر یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ ماسٹر صاحب انگریزی کے آدمی ہیں۔

یوں انگریزی زبان میں ان کی مہارت تسلیم شدہ تھی۔ وہ انگریزی زبان و ادب سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس میں مضمون نگاری اور شاعری بھی کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب ندوہ سے تعلق کے دوران چند سال کے لئے لکھنؤ کے سلم کالج متاز انٹر کالج کے پرنسپل بھی مقرر ہوئے جس کو انھوں نے بحسن و خوبی انجام دیا، اس وقت سے ندوہ سے ان کا تدریسی تعلق رضاکارانہ ہوگیا تھا جس کو انھوں نے متاز انٹر کالج سے جو کہ بعد میں ڈگری کالج ہوا ریٹائر ڈ ہونے کے بعد برابر جاری رہا اور اپنی عمر کے آخری دنوں تک ماسٹر صاحب نے اس کو انجام دیا، اور ندوہ کے بیشمار فرزندوں کے استاذ بنے۔ ایک طرف ان کے ابتدائی زمانۂ تدریس کے شاگردوں میں ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء مولانا صہب اللہ لاری ندوی اور ان کے ہم درس ساتھی ہیں تو دوسری طرف دار العلوم ندوۃ العلماء کے موجودہ طلبہ میں سے درجہ ہفتم عربی تک کے طلباء ہیں۔

ماسٹر صاحب نے اپنے صاحبزادہ ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی کی دعوت پر ۱۹۷۸ء میں امریکہ کا سفر کیا تھا۔ وہاں ایک سال قیام کے بعد یورپ اور شرق وسطیٰ ہوتے ہوئے ہندوستان مراجعت کی، وہ بہت مسرت کے ساتھ کہتے تھے کہ دنیا کے جن ملکوں میں میں گیا مجھے ہر جگہ میرے شاگرد ملے اور بڑی خاطر و احترام سے پیش آئے۔

ماسٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہوئی لیکن مرض الوفات کے تین دن کے علاوہ زندگی کے آخری دن تک وہ کام کرتے اور پڑھاتے رہے، ماسٹر صاحب بڑھاپے کی کمزوری کے قائل نہ تھے آخر تک چست اور سرگرم کار رہے، وہ اپنے جوان یا ادھیڑ عمر شاگردوں سے ملتے تو یہ ضرور کہتے کہ دیکھو میں ۸۰ سال کا ہوچکا ہوں، لیکن بالکل کمزور نہیں ہوں، کام میں سست نہیں ہوں۔ یہ کہہ کر جوانوں ہی میں نہیں بلکہ ادھیڑ عمر کے لوگوں میں زندگی اور عمل کی روح پھونکتے۔

ماسٹر صاحب کو جو ہر دلعزیزی حاصل تھی اس کی بنا پر ان کی رحلت پر بیشمار آنکھیں اشکبار ہوئیں اور ان کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہونچانے میں ان کے شاگردوں اور محبین کا ایک عظیم مجمع تھا۔

ماسٹر صاحب انگریزی، فارسی، اردو تینوں میں ایم اے تھے انھوں نے فن تعلیم کی تعلیم حاصل کی تھا اور اسکی

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہوچکا ہے لہذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دین و ادب کا خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان آپکی خدمت میں پہنچتا رہے تو اس کا سالانہ چندہ مبلغ بیس روپے ارسال فرمائیے۔ اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا چندہ یا خط موصول نہ ہوا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو دی۔ پی ہا سے چندہ ادا کرنے میں سہولت ہے۔ اگلا پرچہ مع دی۔ پی خرچ Rs. 24/25 کے مطالبہ میں دی۔ پی سے روانہ ہوگا۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔

(عربی سے ترجمہ)

سالِ نو! کیا کھویا کیا پایا

شیخ محمد بن احمد بن حسن خزرجی (ابو ظبی)

محرم الحرام سال کا پہلا مہینہ ہے۔ محرم میں انسان عمر کا ایک سال ختم کرکے اگلے سال میں قدم رکھتا ہے اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا سے ایک سال قریب دور اور آخرت سے ایک سال قریب ہوجاتا ہے، نیا سال شروع ہو تو انسان اپنا جائزہ لے کہ سال گزشتہ اس نے کون سے وہ نیک کام کئے ہیں جن کی بنیاد پر شروع ہونے والے سال کے ستون قائم ہونگے۔

کیا ہم کبھی اپنے معاشرہ کی اصلاح کے بارے میں سوچتے ہیں تاکہ پورا معاشرہ ہر طرح کی خیر و بھلائی سے بہرہ ور ہو، کیا ہم زندگی کے نشیب و فراز کو اور اس کے پیدا شدہ خلا کو اچھے وسائل و ذرائع کو اپنا کر ہموار و درست کرنے میں جلدی و مستعدی دکھاتے ہیں؟ کیا ہم واقعۂ ہجرت کو یاد کرکے جس سے سنہ ہجری کا آغاز ہوا ہے سبق و عبرت حاصل کرتے ہیں، اور اس سے مستقبل کے پیچیدہ اور تاریک حالات کو درست کرنے کا سبق حاصل کرتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ اس کے برخلاف ہمارے اندر کی زندگی میں انانیت و خودسری پائی جاتی ہے، جو ہم میں سے ہر فرد کی زندگی میں نمایاں ہے، اور وہ بہت سے علماء و حکام، خواص اور عوام کے کردار میں ظاہر ہو رہی ہے، یہ چیز خودپسندی اور خودغرضی میں مبتلا کرتی ہے، علم کی روشنی سے روکتی اور اس سے صحیح فائدہ اٹھانے سے مانع ہوتی ہے، اچھے عمل سے روکتی ہے اور انسانی زندگی کی قیمتی اور بلند ترین چیزوں کو چھین لیتی ہے، لذتوں سے محروم کردیتی ہے، وہ قیمتی چیزیں، دل کی پاکی، خدا کی معرفت و محبت اور اس کے مطابق عمل ہیں، خودپسندی ان گرانبہا نعمتوں کو چھین کر، دل کے اندر بغض و کینہ، حسد و لالچ، غرور و گھمنڈ اور دنیا کی محبت پیدا کردیتی ہے، قیادت و سرداری کا شوق، ہم عمروں اور ہمسروں پر بلا ڈالنے کا جذبہ ابھارتی ہے تاکہ لوگوں پر غلبہ اور ظلم کے لئے میدان صاف ہو، اور مال و زر جمع کرتا جائے، چاہے دوسرے محروم ہوں۔

اس کے نتیجہ میں ایمان کمزور ہوتا جاتا ہے، دنیا کی محبت اور خواہشات نفس کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے، ایسے ہی لوگوں کے لئے خدا کا ارشاد ہے:

"أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ" (بقرہ - ۸۶)

(یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی، سو نہ تو ان سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو (اور طرح کی) مدد ملے گی)۔

تاریخ اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت اور آپ نے ہجرت میں جو کچھ جھیلا، پھر اس کے بعد جو فوائد و منافع حاصل ہوئے ان میں نفس کے بیمار اور بصیرت سے محروم شخص کے لئے شفا ہے، ہجرت کی یاد ہمتوں کو بلند کرنے کا ذریعہ ہے اور نفس کو وہ منصب حاصل کرنے کے لئے تیار کرتی ہے جس کے سامنے غیر ختم ہوجاتا ہے، پر اگندہ حالی دور ہوجاتی ہے، عزم و حوصلہ بلند ہوتا ہے، روحانی بلندی حاصل ہوتی ہے، دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے اس کی یاد سے عزم کی تجدید ہوتی ہے اور بڑے بڑے معاملات کو سلجھانے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان اتحاد و محبت میں ایک جسم کی مانند ہوجاتے ہیں کہ جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہو تو اس کی کسک پورا جسم محسوس کرتا ہے۔ یہ یاد مسلمانوں کے ظاہر و باطن کو یکساں کردیتی ہے، یہ تصور کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں زبان نبوت سے ادا ہوا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرماکر مدینہ منورہ اس لئے گئے کہ اس کو ایک مضبوط و محفوظ قلعہ بنائیں اور اہل مدینہ کا ایک وفادار لشکر تیار کریں، کہ اس سے دشمنان اسلام کا مقابلہ ہوسکے، اور انکے زور کو توڑ دیں۔ عزت خواہش و تمنا سے نہیں حاصل ہوتی، بلکہ اسباب و وسائل کو اپنانا پڑتا ہے، جس سے سامان جنگ اور فوج مہیا کی جائے۔

آپ کے ساتھ ان صحابہ کرام نے ہجرت فرمائی جنھوں نے دین کی خاطر اہل و عیال، مال و منال، اور وطن و دیار کو چھوڑا، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

" وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ۔ (انفال ۷۴)

(اور جو ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور خدا کی راہ میں لڑا ایمان کرتے رہے اور جنھوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ سچے مسلمان ہیں، ان کے لئے (خدا کے ہاں) بخشش اور عزت کی روزی ہے)۔

اس وقت بھی اگر ہم اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو باہمی اتحاد اور مدد و تعاون، اللہ تعالیٰ سے مدد و نصرت کی طلب اور دینی اصولوں پر کاربند ہوئے بغیر ممکن نہیں، ہم امت مسلمہ کے شعور کو بیدار کریں اور کسی مرحلہ میں اسلامی تعلیمات سے منحرف نہ ہوں اور حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ سے جو تاریخی جملہ فرمایا تھا اس کو اپنے پیش نظر رکھیں۔

"ابو عبیدہ! ہم ایسی قوم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام ہی کے طفیل عزت بخشی۔ اگر ہم اسلام کو چھوڑ کر کسی اور ذریعہ سے عزت حاصل کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ہم کو ذلیل کرے گا۔"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

"إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ"

(آل عمران - ۱۶۰)

(اگر خدا تمہارا مددگار رہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو تمہاری مدد کرے اور مومنوں کو چاہیئے کہ خدا ہی پر بھروسہ رکھیں)۔

دعاءِ مغفرت

مولانا محمد اسحٰق صاحب ندوی سندیلوی، سابق مہتمم و استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء حالیہ مقیم کراچی کی اہلیہ کا ۱۸ر ذی الحجہ مطابق ۲۱ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کو کراچی میں انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں یہ خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی گئی۔ مولانا کے شاگرد اور رفقاء مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

قارئین تعمیر حیات سے بھی دعاء مغفرت کی درخواست ہے۔

پتہ: مولانا محمد اسحٰق ندوی سندیلوی
ڈی ۲ - بلاک آئی،
بابا کارپوریشن شمالی ناظم آباد۔ کراچی (پاکستان)

اس شمارے میں!

۱۔ سال نو کیا کھویا کیا پایا؟	۲
۲۔ ماسٹر محمد سمیع صدیقی مرحوم	۳
۳۔ دار العلوم میں تعزیتی جلسہ	۴
۴۔ عربی زبان کی تحصیل و مہارت کا سب سے طاقتور محرک	۵
۵۔ انقلابی ایران کے بعض حقائق	۸
۶۔ اسلامی بینک	۱۱
۷۔ سوال و جواب	۱۲
۸۔ طلبہ کا صفحہ	۱۳
۹۔ ندوہ کے شب و روز	۱۵

ماسٹر محمد سمیع صدیقی کے انتقال پر

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعزیتی جلسہ

ماسٹر محمد سمیع صدیقی کے انتقال پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں تعزیتی جلسہ ہوا جس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے خطاب فرمایا، یہ بات ملحوظ رہے کہ حضرت مولانا ماسٹر صاحب کے انتقال کے وقت جنوبی ہند تشریف لے گئے تھے اور آپ کو انتقال کی خبر تاخیر سے بمبئی میں ملی۔

(ابو جابر تسنیم عثمانی)

آپ نے حمد وثنا کے بعد فرمایا،

ساتھیو! بھائیو اور عزیزو!

میرے لئے ہمیشہ سے یہ ایک دشوار اور نازک کام رہا ہے کہ میرا جن لوگوں سے قلبی تعلق ہے اور جن کے ساتھ زندگی کا کچھ وقت گذرا ہے ان کے جلسہ تعزیت میں تقریر کروں۔ ایسے موقعے بار بار آئے، اور یہ زندگی ایک ضرورت ہے، ضرورت ہی نہیں بلکہ اس کی ایک بڑی اہم، اخلاقی، تعلیمی، تربیتی اور شرعی افادیت بھی ہے۔

اس وقت میرے لئے دو جذبے محرک ہیں۔ ایک تو یہ قلق ہے کہ میں ایسے موقع پر موجود نہ تھا کہ اپنی طویل رفاقت اور شاگردی کا خراج ادا کرتا۔

دنیا میں پرخلوص اور بے غرض زندگی کی جو قدر وقیمت ہے اور زندگی میں جو معنویت ہے اور تھوڑی سی لذت اور کیف ہے، وہ انھیں تعلقات وجذبات کی بنا پر ہے۔ یہ جذبات واحساسات ختم ہو جائیں تو دنیا کاروبار کی ایک منڈی بن کر رہ جائے اور الحمد للہ یہ جذبہ بڑا پاکیزہ ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو بھی پسند ہے۔ "من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ" میں اسی کی طرف اشارہ ہے پھر "اذکروا محاسن موتاکم" اس میں بھی اسی کی ترغیب ہے کہ دنیا سے جانے والوں کی خوبیوں کا تذکرہ کرو۔ اب اس وقت اس موجودہ نسل میں ندوے کے فارغین اور منتسبین میں چند ہی آدمی ہوں گے جن کا اتنا طویل تعلق اور رفاقت ہوگی جس میں ہمارے مہتمم جناب حبیب اللہ ندوی صاحب بھی ہیں اور اس وقت جو لوگ باقی رہ گئے ہیں ان میں ایسے ہی لوگ سینئر ہیں، تو اس کا تقاضہ ہے کہ کم سے کم اپنے قلبی جذبات واحساسات کا تذکرہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک محرک اور بھی ہے وہ یہ کہ دنیا میں ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جو بہت عالی مرتبہ اور عظیم دینی، روحانی یا سیاسی اور مادی حیثیت سے بہت شہرۂ آفاق ہوتی ہیں اور جن کی عظمت تسلیم کیجاتی ہے اور مشہور ہوتی ہے۔ عام طور پر انھیں کی زندگیوں کا تذکرہ کرنے کا رواج ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نفسیات کے ایک بہت حقیر طالب علم کی حیثیت سے اور شخصیات کے ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے اس میں تواضع سے کام نہیں لیتا، اور شخصیات کے اچھے طالب علم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ میرے گھر میں اس عہد کی طویل ترین اور مکمل ترین شخصیات کا . . . . تذکرہ لکھا گیا اور بچپن سے میرے لئے سب سے زیادہ جو مانوس موضوع ہے اور بیماری میں بھی جس پر میں کتابیں پڑھ سکتا ہوں وہ شخصیات کا موضوع ہے۔

میرا تجربہ اور میرا مطالعہ یہ ہے کہ بہت بڑی شخصیتیں جن کو ساری دنیا مانتی ہو اور تمام دنیا میں ان کا ڈنکا بج رہا ہو، جن کا طوطی بول رہا ہو ان کا تعارف کرانے اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا، اس لئے کہ لوگ کہتے ہیں کہ صاحب یہ تو بہت مافوق الفطرت یا غیر معمولی قسم کی شخصیت ہے، ہم اس کی تقلید نہیں کر سکتے فائدہ ضرور ہے اور میں خود یہ کام کرتا آرہا ہوں لیکن اس میں عام طور پر آدمی اپنے ذہن میں ایک عذر تلاش کر لیتا ہے کہ یہ تو ماورائے عمل اور ماورائے تقلید ہیں، بلکہ ان شخصیتوں کا تعارف کرانا ان کی شخصیت کے عملی پہلوؤں کو، قابل تقلید پہلوؤں کو، قابل رشک پہلوؤں کو نمایاں کرنا، اجاگر کرنا مفید ہوتا ہے جو چاہے ہم سے بلند ہوں لیکن عام انسانی سطح کے لوگ ہوں اور جنھوں نے مخالف ماحول میں اور ناسازگار حالات میں اپنے کردار کی خصوصیات اور اپنا دین سے تعلق قائم رکھا ہو، ان کا تذکرہ کرنا بہت مفید ہوتا ہے اور مہمیز کا کام دیتا ہے، تازیانہ کا کام دیتا ہے۔ اور ایسے ماحول میں بھی آدمی دین کو قائم رکھ سکتا ہے اپنے کردار کو باقی رکھ سکتا ہے، استقامت کا ثبوت دے سکتا ہے اور دوسروں کو نفع پہونچا سکتا ہے اور اس کی زندگی خدمت خلق کا نمونہ ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا صرف مادیت پر قائم ہے یہ لوگوں کی بھول ہے یہ دنیا مادیت پر ضرور قائم ہے لیکن شرافت پر بھی قائم ہے جس دن اس دنیا سے شرافت ختم ہوئی اس دن دنیا کی روح نکل جائے گی اور پھر یہ دنیا کاٹنے کو دوڑے گی، آدمی کا گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ تھوڑی بچی کھچی روایت جو قائم ہے کہ آدمی کسی کو بڑا مانتا ہے کسی کا احسان مانتا ہے، کسی سے بے غرض محبت کرتا ہے اس کی خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے۔ اور تاریخ کی آبرو بھی اسی سے قائم ہے کہ آدمی کسی کا احسان مانتا ہے کسی سے محبت کرتا ہے اور یہ وہ چیز ہے کہ جب یہ دنیا سے لے لی جائے تو پھر دنیا میں دم گھٹنے لگے، جیسے مچھلی کو پانی سے باہر نکالنے سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہمارا آپ کا دم گھٹنے لگے گا۔ اگر یہ تعلقات کا رشتہ نہ ہو اور تعلقات کا اثر قلب ودماغ پر نہ ہو تو پھر دنیا میں جی نہیں لگ سکتا۔ پھر تو خالی دوکان ہے اور دوکان بھی کیا بلکہ یہ ایک قمار خانہ ہے کسی کی ہار کسی کی جیت۔ اور یہ اس کا بھی تقاضا ہے کہ ہماری اور انکی رفاقت بے لوث اور پرخلوص طریقہ پر رہی اور میں شہادت دیتا ہوں کہ ماسٹر صاحب نے آجتک اپنی ذاتی غرض کے لئے مجھے یاد نہیں کہ کچھ کہا ہو، اور اس کے برخلاف میں نے ان سے فائدہ اٹھایا پڑھا۔ ہر وقت وہ فائدہ پہونچانے کے لئے تیار رہتے تھے، اور ہمارا جن چند آدمیوں سے عزیزوں کی طرح تعلق تھا ان میں ایک ماسٹر صاحب بھی تھے۔

سفر امریکہ میں کچھ دن قیام ماسٹر صاحب کے لڑکے ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی کے یہاں قیام کرنا پڑا جن کے مکان کا نام ندوہ ہے جو ندوہ سے تعلق کی اعلیٰ ترین مثال ہے اور اس کو میں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں ندوہ، نیویارک امریکہ لکھا ہے۔ اس وقفہ میں ماسٹر صاحب کی آمد کا علم ہوا تو مجھے اور عزیزی محمد رابع ندوی جو اس وقت میرے رفیق تھے کو ایسی خوشی ہوئی کہ جیسے اپنے خاندان کے ایک بہت ہی قریبی بزرگ اور عزیز کا انتظار ہوتا ہے۔

یہ وہ محرک ہے جو مجھ سے تکلفاً نہیں جذباتی طور پر کہلوانا چاہتا ہے کہ بھائی یہ چیز دنیا سے بہت تیزی کے ساتھ گھٹ رہی ہے کہ بے لوث محبت ہو اور جو تعلق پہلے سے قائم ہو گیا وہ اخیر تک رہے۔ یہ واقعات ہمارے معاشرے کے بہت چیدہ اور برگزیدہ افراد کے حالات میں آپ کو ملیں گے۔ یہ چیز میں نے ماسٹر صاحب میں دیکھی اور ان کے صاحبزادوں کے ماموں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب میں دیکھی، اور ایسے ہی اس عہد کے اور کئی وضعدار لوگوں میں۔

اس کا تقاضا ہے کہ میں اسوقت انکا ذکر کر رہا ہوں اس طریقہ سے کہ میرا دل و دماغ شریک ہے اس میں کوئی تکلف اور کوئی بناوٹ کی بات نہیں، انھوں نے اس تعلق کو نباہا اور ایسا نباہا کہ یہاں کی زمین جو پکڑی یہاں سے مر کر جو اٹھنا تھا وہیں مر کر اٹھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی روح نے قفس عنصری سے اسپتال میں پرواز کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا سفر انھوں نے یہاں سے اختیار کیا۔ یہ تو اضطراری اور وقتی بات تھی۔ انھوں نے جو در پکڑا اسے چھوڑا نہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمارے لئے اور آپ کے لئے قابل تقلید ہیں۔

دوسرا محرک جس کے لئے میں نے کہا کہ بڑے ممتاز اور بہت برگزیدہ شخصیتوں کا انتخاب درست نہیں ہے حق بجانب نہیں ہے بلکہ ان شخصیتوں کا بھی جن کو ان کے حلقۂ احباب کے علاوہ باہر کے لوگوں نے کم جانا۔ بعض وقت ان کی زندگی کے پہلو بہت زیادہ قابل رشک اور قابل تقلید ہوتے ہیں ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ ماسٹر صاحب کی ساری تعلیم وتربیت جدید تھی انھوں نے تعلیم کے لئے یورپ کا سفر نہیں کیا تھا مگر اس کے علاوہ ان میں کوئی کمی نہیں تھی انگریزی زبان پر ان کو ایسی قدرت تھی کہ اس میں شاعری کرتے تھے۔ حالانکہ انگریزی زبان کا شعر پڑھ دینا بہت مشکل ہے لیکن وہ اس میں شعر کہتے تھے اور بڑی روانی کے ساتھ اس میں شاعری کرتے تھے پھر ان کی انگریزی میں جتنا ہم لوگوں کو علم ہے اور دوسروں سے بھی سنا ہے کہ بہت ممتاز تھی اور اصول تعلیم کے جو مروجہ معیار تھے وہ ان کو حاصل تھے مگر ان سب کے باوجود جو چیز ہمارے آپ کے لئے قابل تقلید ہے وہ یہ کہ ان کی دینداری میں فرائض کی پابندی میں تشرع اور خدا ترسی میں اور خوش اخلاقی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ورنہ ہم نے تو ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ آٹھ آٹھ نو نو دس دس برس انھوں نے کسی اچھے دینی معیاری مدرسہ میں پڑھا اور تھوڑے دنوں کے لئے کسی کالج میں گئے اور اس طرح بدلے کہ صورۃً وسیرۃً ان کو پہچاننا مشکل ہو گیا اسی ماحول کے

(بقیہ صفحہ … پر)

عربی زبان کی تحصیل ومہارت کا سب سے طاقتور محرک

اور اس کے محیر العقول نتائج

ذیل میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی وہ افتتاحی تقریر درج کی جاتی ہے جو انھوں نے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لنگویجس حیدرآباد (Central Institute of English and Foreign languages) کے آل انڈیا عربک سیمینار منعقدہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۲ء میں کی۔ جس کی صدارت نواب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اتر پردیش نے کی۔ ابتدا میں انسٹی ٹیوٹ کے صدر شعبۂ عربی ڈاکٹر عبد الحلیم ندوی نے عربی میں حاضرین کا خیر مقدم کیا، پھر انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رمیش موہن نے سیمینار کے اغراض ومقاصد انگریزی میں بیان کئے۔ ڈاکٹر اعجاز احمد صاحب ریڈر لکھنؤ یونیورسٹی نے مولانا کے تعارف میں انگریزی میں مضمون پڑھا، اس کے بعد مولانا نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا۔ تقریر ٹیپ کر لی گئی تھی، مولانا کے نظر ثانی اور خفیف ترمیم واضافہ کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔ یہ تقریر ٹیپ کی مدد سے مولوی مظہر ہاشمی ندوی نے قلمبند کی۔

بعد حمد وصلوٰۃ۔

صدر محترم، ڈائرکٹر صاحب، فضلائے کرام!

میں سب سے پہلے اس کی اجازت چاہتا ہوں کہ مجھے اردو میں خطاب کرنے کا موقع دیا جائے، اگرچہ میرے لئے بڑی عزت بلکہ لذت کی بات تھی کہ میں عربی جیسی شیریں وسیع اور بلیغ زبان میں خطاب کروں، خاص طور پر اس سیمینار کے موقع پر جس کی زبان عربی قرار دی گئی ہے، لیکن حیدرآباد میں اور جامعہ عثمانیہ کے سایۂ دیوار کے نیچے اردو کے سوا کسی اور زبان میں خطاب کرتے ہوئے لحاظ آتا ہے کہ اردو کی ترقی میں اور اس کو ذریعہ تعلیم بنانے میں حیدرآباد کو جو اولیت اور جامعہ عثمانیہ کو جو فخر حاصل ہے اس کا تقاضہ ہے کہ میں اسی زبان میں اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کروں[1]۔

اس موقر مجلس مذاکرہ (سمینار) کا افتتاح (INAGURATE) کرنے کے لئے میرا انتخاب کر کے آپ نے مجھے جو عزت بخشی اس اعزاز اور میرے اس کو قبول کرنے کا اگر کوئی جواز ہو سکتا ہے تو وہ وہی ہے جس کو علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں ادا کیا ہے، وہ فرماتے ہیں ؎

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

جیسا کہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر اعجاز نے اپنے تعارفی مقالہ میں بیان کیا ہے[2] میں نے عربی زبان کو اظہار خیال کا اصل ذریعہ بنایا ہے، میری زیادہ تر کتابیں جن کو موضوع کے لحاظ سے اہم سمجھتا ہوں اصلاً عربی میں لکھی گئیں پھر ان کا اردو وانگریزی میں ترجمہ ہوا، اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ میں عجمی نژاد اور ہندی المولد ہوں مری نوا عربی رہی۔

حضرات! کسی ملک میں کسی دوسرے ملک کی زبان پر توجہ مرکوز کرنا اس پر اپنی ذہانت، اپنی صلاحیت اور اپنے وقت کا سب سے بڑا حصہ صرف کرنا حقیقتاً ایک غیر طبعی بات ہے (UN NATURAL) جس کے لئے معقول اور طاقتور محرکات واسباب کی ضرورت ہے، فطرت انسانی ہے کہ انسان کو اپنی مادری زبان سے محبت ہوتی ہے اور اس کے فطری جوہر اسی میں کھلتے ہیں۔ ادبیات عالم اور لغات والسنہ کی تاریخ کی ناقابل انکار شہادت ہے کہ انسان کی ذہانت اور اس کے حقیقی جذبات وخیالات کا سب سے بڑا مظہر اس کی زبان ہوتی ہے، اس کی محبت و درد اور اس کے جوش اندروں کا چشمہ اسی میں اپنی طبعی رفتار اور اپنے طبعی جوش کے ساتھ فوارہ کی طرح اُبلتا ہے، کسی ملک کے باشندے دوسرے ملک کی زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں، اس پر اپنی بہترین ذہانتیں صرف کریں، اس میں وہ دنیا کے لئے ادب وشاعری کے لافانی نقوش چھوڑ جائیں، اس کے میرے محدود مطالعہ میں چار ہی محرکات واسباب ہو سکتے ہیں، سیاسی، معاشی، علمی، مذہبی و روحانی۔ دنیا نے ان چاروں محرکات کا تجربہ بھی کیا ہے۔ سیاسی محرک ہمارے اور آپ کے سامنے ہے، جب ہندوستان برطانوی حکومت کے زیر اقتدار آیا، اور ہندوستان کا برطانیہ سے ایک سیاسی اور معاشی رشتہ قائم ہو گیا اور ہندوستان کے حوصلہ مند نوجوانوں کے لئے جو کوئی امتیاز پیدا کرنا اور اپنی صلاحیت کا اظہار کرنا چاہتے تھے ضروری ہو گیا کہ وہ انگریزی زبان میں کمال پیدا کریں۔ جہانتک اس دور کا تعلق ہے۔ یہ دونوں محرکات آکر مل گئے اور اُن کا سنگم ہوا، (زبان میں شُدبُد پیدا کرلینا یہاں ہمارے موضوع سے خارج ہے) اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ہندوستان کے ذہین وباصلاحیت افراد عصری تعلیمگاہوں، انگریزی اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہوئے، اس تاریخی عمل کا تسلسل پوری ایک صدی تک جاری رہا ہمیں دیکھنا ہے کہ اس سیاسی اور معاشی محرک کے علمی وادبی میدان میں کیا نتائج برآمد ہوئے؟

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں ہندو و مسلمانوں میں انگریزی کے ایسے اہل قلم و مقرر پیدا ہوئے جن کی تحریروں کو اہل زبان (انگریزوں) نے بھی دلچسپی سے پڑھا اور تقریروں کو دلچسپی سے سُنا اور اعتراف کیا یہ انگریزی پر قدرت رکھتے ہیں، لیکن یہ دونوں طاقتور محرک مل کر کے بھی ہمارے ہندوستان کے انگریزی دانوں کو اس سطح پر نہیں پہنچا سکے کہ اہل زبان انگریز ان کا لوہا مان لیں اور تسلیم کریں کہ ہم ان کی تحریروں وتقریروں سے استفادہ کر سکتے ہیں، وہ ادب وزبان میں ہمیں مشورہ دے سکتے ہیں، تنقید وشعر وشاعری کی اداؤں اور تیوروں کو پہچانتے ہیں۔ وہ ہماری زبان میں ہمارے ہم پایہ و ہم پلہ بلکہ ہم سے کچھ آگے ہیں۔ یہ بات نہیں ہو سکی۔ چند حضرات کہ جن کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، انھوں نے انگریزی کو تسلیم کیا اور مانا کہ وہ صحیح انگریزی لکھتے اور اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ مسلمانوں میں دیکھئے (ہمارے صدر محترم اس نام سے خوش ہوں گے) تو انگریزوں نے مولانا محمد علی جوہر کی انگریزی کو تسلیم کیا، ان کے کامریڈ (COMRADE) کو انگریز آفیسر اور باذوق انگریز منگواتے تھے، اس کی زبان وطنزیات کا چٹخارا لیتے تھے، اس کے علاوہ علامہ عبد اللہ یوسف علی، احمد شاہ پطرس بخاری (جو آل انڈیا ریڈیو کے بانی اور اس کا سانچہ بنانے والے تھے) کی انگریزی کو تسلیم کیا۔ خواجہ کمال الدین آپ کے ہاں کے ڈاکٹر سید عبد اللطیف اعلام اقبال انگریزی میں بے تکلف لکھتے اور اظہار خیال کرتے تھے۔ حیدرآباد میں سر امین جنگ نے بھی انگریزی میں لکھا ہے لیکن یہ بات کہ انگریز ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے اور ان کی تحریریں پڑھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آئے اور وہ اس کا لطف لیں، ان کا ادبی ذوق اور حاسہ اس سے غذا پائے ایسا نہیں ہو سکا، ان میں چند ہی مستثنیات ہیں، جن میں اسپرٹ آف اسلام (SPRIT OF ISLAM) کے مصنف رائٹ آنریبل سید امیر علی کا پایہ سب سے بلند رہا، کسی ملک کی نوجوان نسل کو دوسرے ملک کی زبان کی مہارت اس بام عروج تک نہیں پہنچا سکی، جس بام عروج پر ان کو اپنی ذہانت جانکاہی وجگر سوزی کے لحاظ سے پہنچنا چاہئے تھا، ان میں سے بہت سے لوگ تو ایسے تھے جنھوں نے اپنی زبان کو بھلانے کی کوشش کی اور انھوں نے انگریزی زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا لیکن اس کے بعد انگریز ادیبوں اور اہل قلم نے دل پر پتھر اور آنکھوں

[1] مقرر کے پیش نظر اردو میں تقریر کرنے کی یہ مصلحت بھی تھی کہ حاضرین کی ایک تعداد کو (جس میں صدر محترم اور ڈائرکٹر صاحب بھی شامل تھے)، تقریر کے ترجمہ کی ضرورت پیش آتی، جس میں وہ تازگی اور طاقت باقی نہ رہتی۔

[2] اس مختصر تقریر میں ان سب حضرات کا نام لینا دشوار تھا جو انگریزی پر قدرت رکھتے تھے اور اچھے اہل قلم یا کامیاب جرنلسٹ تھے۔ اس سلسلہ میں "انڈیپنڈنٹ" (INDEPENDENT) کے ایڈیٹر مسٹر سید حسین، "بامبے کرانیکل" (BOMBAY CHRONICLE) کے ایڈیٹر سید عبد اللہ بریلوی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا تھا۔

پرشیکری رکھ کر اتنا کہا کہ یہاں صاحب کچھ ہندوستانی اچھی اور صحیح انگریزی لکھ لیتے ہیں۔

تیسرا محرک علمی (ACADEMIC) اور مطالعہ و تحقیق (RESEARCH WORK) کا کام و ذوق ہے۔ اس کا بہترین نمونہ مستشرقین (ORIENTLISTS) ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جیسا میں نے اپنی تازہ کتاب "اسلامیات"[1] میں تفصیل سے لکھا ہے، بیسوں مستشرقین نے خالص علمی و تحقیقی جذبہ سے کام کیا اور اپنے موضوع پر محنت و تحقیق کا ثبوت دیا، اور کبھی کبھی ایسی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے کہ مشرق اور عالم اسلام کے علما بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ان میں سے بعض نے بیسوں نہیں بلکہ تیس تیس، چالیس چالیس برس ایک موضوع کے مطالعہ پر صرف کردئے اس کے بعد انھوں نے اپنے مطالعہ و تحقیق کا نتیجہ دنیا کے سامنے رکھا۔ لیکن ان کا مطالعہ بھی (چند کو مستثنیٰ کر کے) نہ بہت وسیع ہوتا ہے نہ بہت عمیق، وہ جس موضوع کو اپنا کر توجہ بناتے ہیں، ان کا مطالعہ بھی اسی میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ عربی علوم اور اسلامیات پر ان کی نظر ہمہ گیر اور عمیق و دقیق نہیں ہوتی، نہ عربی زبان پر (جو اسلامی کتب خانہ کی کلید ہے) ان کو کامل و مستقل عبور ہوتا ہے نہ ان کی تحریروں میں وہ تاثیر ہوتی ہے جو علما کا خاصہ ہے، ہم نے برطانیہ کے بعض چوٹی کے مستشرقین سے مل کر اندازہ کیا کہ ان کو نہ عربی پر قدرت ہے نہ اس کے مختلف مکاتب فکر اور صاحب طرز اسلوب، قدیم ادیبوں اور شاعروں سے پوری واقفیت ہے۔

اب میں عربی زبان کی تحصیل و مہارت کے آخری محرک کو لیتا ہوں جو حقیقت میں اولین محرک ہے، وہ ہے دینی و روحانی، اخلاقی اور اصولی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی زبان کا مطالعہ اس لئے کیا جائے کہ اس کے بغیر وہ دین سمجھ میں نہیں آسکتا جس نے اس زبان کو اپنی دعوت و تفہیم کا ذریعہ بنایا اور اس کے بغیر اس کے مفہوم، صحیح مقاصد اور صحیح روح سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس مقصد سے اس زبان و ادب میں ڈوب جانا پڑتا ہے، اس کو ذوق اور اس کی روح کو اپنے اوپر طاری کرلینا ناگزیر ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ایران کی مثال دیتا ہوں، ایران کو اپنی زبان پر ناز تھا اور بجا طور پر ناز تھا۔ وہ ہم سب کے لئے ادب و تصوف، درد و محبت، نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا خزانہ ہے، ہم آج بھی سعدی، حافظ، مولانا روم، جامی و قدسی، عرفی و نظیری کے کلام پر سر دھنتے ہیں جب ایران نے عربی زبان میں درک پیدا کرنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کی طرف (دینی و اسلامی محرک سے) توجہ کی تو اس نے سیبویہ کو پیدا کیا، جس کی کتاب "الکتاب" اب بھی سند کا درجہ رکھتی ہے اور نحو کی بنیادی کتابوں میں ہے یا نحو کی بنیاد ہے۔ دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ کے مصنف عبد القاہر جرجانی کو پیدا کیا جس کی عربی ادب و شاعری کی نبض شناسی و مزاج دانی کے سامنے عربوں نے بھی سر تسلیم خم کر دیا، زمخشری سکاکی، ابو علی فارسی کس کس کا نام لیا جائے یہ سب عربی ادب اور زبان کے قواعد کے ایوان کے ستون ہیں، عربی علم لغت کو دیکھئے (جو بڑا نازک فن ہے) تو اس میں علامہ مجد الدین فیروز آبادی کی شخصیت نظر آتی ہے جن کی کتاب "قاموس" آج تک ہمارے علمی و درسی حلقوں میں سب سے زیادہ مقبول و مستعمل ہے ایران کے لئے عربی زبان میں کمال پیدا کرنے کا صرف مذہبی اخلاقی اور روحانی محرک تھا۔ عہد قدیم کے ذہین نوجوانوں اور باصلاحیت مسلمانوں نے اس نکتہ کو پالیا تھا کہ ہم قرآن مجید کے اسرار، حدیث کے رموز اور اصول فقہ کی نازک بحثوں سے اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جب تک کہ عربی زبان پر ہم کو استادانہ و مجتہدانہ عبور نہ ہو، اس کا نتیجہ ہے کہ ایران نے اس پایہ کے ائمہ نحو، اساطین عربیت، مجتہدین فن بلاغت، محققین لغت اور مفسر پیدا کئے جن کی نظیر خود عربوں میں ملنی مشکل ہے حتیٰ کہ ابن خلدون جیسے نقاد کو لکھنا پڑا کہ ان اکثر حملة العلم من العجم۔

اب ہندوستان کی طرف آئیے یہاں در اصل اسی محرک نے کام کیا، ہندوستان کے بلاد عربیہ سے سیاسی اور معاشی تعلقات کی عمر آپ میں سے بہت سے لوگوں کی عمر سے کم ہے، ہندوستان میں اتنا عظیم الشان تحقیقی و مجتہدانہ کام علوم دینیہ و عربیہ پر انجام پایا جس کی مثال خود بلاد عربیہ میں نہیں ملتی۔

میں نے ابھی آپ کے سامنے قاموس کا نام لیا ہے، میں جن زبانوں سے واقف ہوں ان میں میری معلومات میں کسی لغت کی اتنی مفصل شرح نہیں ملتی، جیسے قاموس کی شرح تاج العروس ہے جس کے مصنف ہمارے جوار (اودھ) کے ایک فرزند فخر ہندوستان علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی ہیں، جو زبیدی کی نسبت سے مشہور ہیں یہاں تک کہ بہت سے اچھے پڑھے لکھے لوگ ان کو یمنی سمجھتے ہیں، اس کتاب کو مصنف ہی کی زندگی میں (مجازاً نہیں حقیقتاً) سونے میں تولا گیا، اس وقت کے عظیم ملوک و سلاطین نے ان کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور ان سے سندلی، مورخین نے لکھا ہے کہ قاہرہ میں ان کا دربار لگتا تھا جس طرح بادشاہوں کا دربار لگتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں سید مرتضیٰ کے لئے کیا محرک تھا؟ کیا سیاسی و معاشی محرک تھا؟ سیاسی محرک کا حال یہ ہے کہ تمام بلاد عربیہ اس وقت ترکی کے ماتحت تھے اور ترکی کے سیاسی تعلقات کبھی بھی ہندوستان سے باقاعدہ قائم نہیں ہوئے۔ سفارت خانوں کا دور ابھی نہیں آیا تھا، نہ ملازمتوں کا۔ سید مرتضیٰ کے لئے عربی زبان میں اس حد تک کمال پیدا کرنے کے لئے کیا کشش، کیا (CHARM) تھا کہ وہ عربی زبان کی طرف ایسی توجہ کریں اور قاموس کی ایسی شرح لکھیں کہ اگر علامہ مجد الدین فیروز آبادی زندہ ہوتے تو ان کا ہاتھ چومتے، دوسری طرف وہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی زندہ جاوید کتاب "احیاء علوم الدین" کی شرح "اتحاف السادة المتقين شرح احياء علوم الدين" کے نام سے تصنیف فرمائی ہیں جو ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی حیثیت رکھتی ہے۔

علمی اصطلاحات کا فن سب سے نازک فن ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی جہاز پر گھڑی لگی ہوتی ہے جس سے سمت متعین ہوتی ہے، اس میں اگر بال برابر بھی فرق آجائے تو جہاز کہیں سے کہیں پہونچ جائے۔ اسی طرح اگر آپ نے کسی اصطلاح کو غلط سمجھا تو نہ آپ کتاب سمجھ سکیں گے نہ کسی علمی مسئلہ کی صحیح ترجمانی کر سکیں گے، عربی زبان کی علمی تاریخ میں اس موضوع پر سب سے بہتر دو کتابیں لکھی گئیں۔ ایک "دستور العلماء" دوسری "کشاف اصطلاحات الفنون"۔ دستور العلماء مولانا عبد النبی احمد نگری کی تصنیف ہے اور کشاف اصطلاحات الفنون کے مصنف بارہویں صدی ہجری کے عالم شیخ محمد اعلیٰ تھانوی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا جواب پورے عالم عربی میں نہیں ہے۔ اس موضوع پر صرف ایک چھوٹی سی قدیم کتاب خوارزمی کی مفاتیح العلوم ملتی ہے۔ ہم نے یہ بات علماء عرب کے سامنے بھی کہی اور انھوں نے تسلیم کیا، غریب الحدیث (لغات حدیث) کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، اس موضوع پر سب سے بڑی اور مستند کتاب ابن اثیر کی "نہایہ" ہے، لیکن اس موضوع پر سب سے جامع اور قابل اعتماد کتاب جو دوسری کتابوں سے مستغنی کر دیتی ہے، علامہ محمد طاہر پٹنی کی کتاب مجمع بحار الانوار ہے۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں قاہرہ میں اہل علم کے ایک جلسہ میں وہاں کے ایک بڑے ازہری عالم ڈاکٹر احمد شرباصی نے میرے تعارف میں کہا کہ یہ "اس ملک کے باشندے ہیں جس کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہاں مجمع بحار الانوار لکھی گئی، جس سے علماء ازہر بھی مستغنی نہیں ہو سکتے"۔

دوسری طرف علوم دینیہ میں وہ کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں سے بعض کی نظیر پورا کتب خانہ پیش نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں حجۃ اللہ البالغۃ کا نام لے لینا کافی ہے۔ وہ حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب ہے اور اسرار دین و مقاصد شریعت کے موضوع پر ہے۔ اس کے علاوہ یہاں اصول فقہ پر مسلم الثبوت[2] جیسی کتاب لکھی گئی جو عرصہ تک علماء ازہر کی بھی توجہ کا مرکز رہی، اور جس کی کثیر التعداد شرحیں ہیں۔

حضرات! میری اس گذارش کا مدعا یہ ہے کہ کسی زبان کی تحصیل اور اس میں حصول کمال کے محرکات میں سب سے طاقتور محرک دینی اور روحانی ہے۔ یہ محرک وہ جرثقیل ہے جو بڑی سے بڑی وزنی چیز کو۔۔۔۔ چشم زدن میں سطح زمین سے اٹھا کر بڑے سے بڑے ایوان بلند پر پہنچا دیتا ہے اور اس کے کچھ نمونے اور مثالیں میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں، جب صحیح جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو انسان اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں سے بھی بہت آگے بڑھ جاتا ہے اس لئے کہ جب بات ٹھہری دینی اور اندرونی جذبہ کی تو یہ جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا اسی قدر زبان و قلم میں طاقت و تاثیر پیدا ہوگی۔ اگر عربی زبان کا کوئی طالب علم قرآن مجید کو اس

[1] مستشرقین کی کتابوں کے قابل تنقید پہلو اور ان کے نقطۂ نظر و نتائج تحقیق پر ناقدانہ نظر مقرر کے اس عربی مقالہ میں تفصیل سے ڈالی جا چکی ہے جو اس نے دار المصنفین اعظم گڑھ کے اسلام و مستشرقین کے سیمینار کے لئے لکھا تھا اور جس کا اردو میں ترجمہ "اسلامیات اور مغربی مستشرقین اور مسلمان مصنفین" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ [2] یہ کتاب مصنف مسلم ملا محب اللہ بہاری کی تصنیف ہے۔

کی اصل روح کے ساتھ سمجھنا چاہے گا اور اس پر محنت کرے گا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ بڑے سے بڑے عرب سے بڑھ جائے گا۔ ذہانت و اندرونی صلاحیتوں کو حرکت میں لانے والی سب سے بڑی طاقت، عشق اور جذبہ ہے۔ یہی چیز تھی جس نے اقبال کی زبان سے فارسی کا وہ کلام نکلوایا جس کی جدید ایران مثال نہیں پیش کر سکتا۔ لاہور میں بیٹھ کر (جب کہ وہ پنجابی بولتے تھے) ان سے اردو زبان میں وہ اشعار نکلوائے جس کو پڑھ کر خون کی گردش میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور لکھنؤ و دہلی والوں کو بھی ماننا پڑا کہ کلام اقبال میں جو سوز دروں اور بجلی کا اثر ہے، اس میں جو بلند مضامین ہیں وہ ہمارے ان بڑے بڑے شعراء کے کلام میں نہیں جو اس سوز دروں سے محروم ہیں، آپ ایک نعت ہی کو دیکھ لیجئے فارسی اردو کے نعتیہ کلام میں جو تاثیر جو زندگی اور جو جوش و اثر ہے وہ عربی کے نعتیہ کلام میں (باستثناء چند) نہیں ملتا۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں دمشق میں ایک مجلس میں جس میں یونیورسٹی کے شعبہ زبان و ادب کے بعض بڑے اساتذہ اور شہر کے ادبا موجود تھے، ایک صاحب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ بتائیے کہ عربی کے نعتیہ کلام میں وہ اثر کیوں نہیں ہے جو فارسی، اردو کے نعتیہ کلام میں ہے جیسا کہ آپ کے ترجموں اور آپ کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو احساس فراق اور بُعد۔ جن لوگوں نے یہ کلام کہا جامی ہوں یا قدسی، اقبال ہوں یا ظفر علی خاں۔ ماہر القادری ہوں یا امجد حیدر آبادی۔ ان کے اندر اشتیاق اور بعد و محرومی کا احساس تھا دوسرے سوز دروں اور تڑپ جس کی وجہ سے ان کے اندر سے مضامین ابلے اور کلام میں تاثیر پیدا ہوئی۔ یہی حال اس دور کے ان دعوتی مضامین کا ہے جو بعض ہندوستانی داعیوں کے قلم سے عربی میں نکلے اور اسی جذبہ اور پس منظر نے عربی انشاء و ادب کا ایک نیا اسلوب پیدا کر دیا جس میں وہ طاقت و دل آویزی ہے جس سے بڑے بڑے عرب ادباء اہل قلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور بارہا ان کی آنکھیں اشکبار ہوئیں۔

حضرات! میں عربی زبان کی سیاسی و معاشی اہمیت و افادیت کا انکار نہیں کرتا، لیکن آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس کے ساتھ اس بنیادی حقیقت کا اضافہ کریں کہ اس کا اصل فائدہ دین کو صحیح طور پر سمجھنا، قرآن و حدیث کے معجزات کو قرآن و حدیث کی ہی زبان میں ان کے لانے والے کے منشا کے مطابق معلوم کرنے کی کوشش کرنا اور کچھ "سوز دروں" پیدا کرنا ہے، پھر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عربی زبان آپ کے لئے اپنے خزانے اُگل دے گی، میں آپ سے عرض کروں گا کہ عربی زبان خالص سیاسی و معاشی زبان نہیں ہے۔ انسانوں، قوموں اور ملکوں کی طرح زبانوں کا بھی مزاج و منفرد شخصیت ہوتی ہے، عربی زبان کا مزاج نبوی، ایمانی اور دعوتی ہے، عرب شاعر نے کہا تھا ؎

ومكلف الأشياء ضد طباعها
متطلب في الماء جذوة نار

(جو کسی چیز سے اس کی طبیعت کے خلاف کام لینا چاہتا ہے وہ ایسا ہے جیسے پانی میں سے کوئی آگ کا شعلہ لینا چاہے)۔

آپ کے اندر عربی زبان کی بنیادوں کے ساتھ ہمدردی اور دلچسپی کا جذبہ ہونا چاہئے عربی زبان جن بنیادوں پر پیدا ہوئی اور پروان چڑھی اور اس کا یہ حق ہوا کہ ہم ہندوستان میں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کریں اور اس میں کمال پیدا کریں، ہم کو ان بنیادوں کو اپنے اندر مستحکم کرنا چاہئے اس وقت آپ دیکھیں گے کہ آپ عربی زبان میں اس سے کم وقت میں کمال پیدا کرلیں گے جتنے وقت میں آپ دوسرے محرکات کے ماتحت پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ سمینار بڑے وقت پر اور بڑے اہم و ضروری مقاصد کے ماتحت ہو رہا ہے۔ اس کے نصاب و طریقہ تعلیم پر غور و فکر ہونا چاہئے اور اس کو زیادہ مفید و مؤثر بنانے کی تدبیروں پر غور و خوض ہونا چاہئے۔ وہ مضامین آپ کے سامنے آئیں گے جو نصاب اور طریقۂ تعلیم سے بحث کرتے ہیں۔ ہم عربی مدارس کے اساتذہ اور ذمہ داروں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ میں اپنے عزیز دوست ڈاکٹر عبد الحلیم ندوی سے درخواست کروں گا کہ وہ اس ادارہ کی طرف سے ان مضامین کے مجموعے شائع کریں۔ وہ اس سمینار کی ایک اچھی یادگار اور ایک مفید کام ہوگا۔

آخر میں، میں پھر اس اعزاز اور اور اظہار خیال کے اس زریں موقعہ کے فراہم کرنے پر ادارہ کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

**

بقیہ ص ۴

رنگ میں رنگ گئے۔ لیکن جو زیادہ فکر کی بات ہے وہ یہ ہے کہ ان کے عقائد تک میں فرق پڑ گیا اور فرائض بھی ترک ہونے لگے۔

واقعہ یہ ہے کہ ماسٹر صاحب کی ساری تعلیم انگریزی تھی۔ اس دار العلوم میں سنہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۵۰ء سے رہے اس سے پہلے تو بہرحال وہ اُسی ماحول میں تھے لیکن جب سے ہم نے دیکھا اور یہاں کے دیکھنے والے سینکڑوں افراد ہوں گے کہ ماسٹر صاحب حتی الامکان صف اول میں اول وقت آجانا اور تکبیر تحریمہ پا لینا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہمارے کتنے عربی مدارس کے فضلاء ہیں جن کو یہ بات نصیب نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو اقبال نے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ میں آتش نمرود میں داخل ہوا اور ابراہیم کی طرح بے داغ نکل آیا، اور جال کے اندر گیا اور دانا لیکر اڑ گیا اور جال میں پھنسا نہیں، مغربی تعلیم کے جال میں پھنسا نہیں، تو یہ بہت بڑی قابل رشک اور میں اس کو ایک درجہ کی ولایت سمجھتا ہوں یعنی ماحول کی مخالفت کے باوجود کوئی آدمی دین پر قائم رہے جما رہے اور دین کے فرائض کے ادا کرنے سے شرمائے نہیں یہ اس زمانہ کے لحاظ سے ولایت سے کم نہیں ہے یہ تو بہت آسان ہے کہ ایک آدمی خالص دینی اور روحانی ماحول میں رہے اور وہ نماز کا پابند ہو۔ کیسی بھلی نماز پڑھتا ہے تو کوئی بڑے کمال کی بات نہیں ہے یہ، اور انگریزی کا عالم اگر فرائض ادا کرتا ہے دین کے شعائر قائم رکھتا ہے تو یہ اس کے لئے آزمائش کی بات ہے کہ اس نے کس انگریزی ماحول میں نماز چھوڑ دی ہو۔ تو ماسٹر صاحب کی جو چیز سب سے قابل رشک ہے وہ اب اللہ تعالیٰ کے یہاں کام آرہی ہوگی وہ یہ کہ اس تعلیم کا ان کے عقائد پر ان کے اعمال و اخلاق پر ان کی سیرت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

ماسٹر صاحب کی زندگی بہت قابل رشک تھی جو سیدھی سادی ایک متوسط الحال آدمی کی طرح انھوں نے پوری گذار دی کسی کو خبر نہیں کہ ان کے بیٹے کون ہیں؟ کیا کیا پڑھا ہے؟ کہاں رہتے ہیں کوئی اظہار مظاہرہ کرتے اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ پانچ وقت کی نمازوں کی پابندی جماعت کے ساتھ یہ تو خود ایک ولایت کی دلیل ہے۔

ماسٹر صاحب ندوہ کی مسجد کے عقب میں رہتے تھے اس نعمت کا شکر کہ اللہ تعالیٰ نے مسجد کا پڑوس عطا فرمایا ہے گویا مسجد کے سایے میں گھر بنایا ہے، خدا کا شکر ہے کہ ہمسایہ خدا ہوں۔ شعر ہے غالب کا، یہ ہمسایہ خدا ہوتا ہے۔ مسجد کے زیر سایہ جو رہتا ہے گویا ہمسایہ خدا ہے۔

ماسٹر صاحب مصنف بھی تھے اور برجستہ انگریزی میں گفتگو کیا کرتے تھے اور بارہا ندوہ کا تعارف انھوں نے اسی زبان میں کرایا وہ فن تعلیم اور اصول تعلیم کے ایک مبصر اور ایک استاد بھی تھے۔ یہ ہمارے اور آپ کے سیکھنے کی چیز ہے۔ اور اس میں دو باتیں بھی آپ سے کہنی ہے۔ ایک تو یہ کہ دیکھئے قرآن مجید میں ہم کو یہ تعلیم دی گئی ہے والذین جاء وا من بعدهم يقولون ربنا اغفر لنا الخ۔۔۔ انك غفور رحيم۔

یہ برسبیل حکایت ہے لیکن حقیقت میں برسبیل ہدایت ہے، اپنے بزرگوں کے لئے اپنے بڑوں کے لئے دعا کرنا یہ ایمان کی علامت ہے اور مومنین کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح کی ہے۔ آپ لوگ دعا میں یاد رکھیں اپنے بڑوں کو اور جن لوگوں کو آپ نے یہاں دیکھا، معلوم نہیں آپ کہاں ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کو آپ سے کیا کیا کام لینا ہے؟ کیا علمی اور دینی ترقی کریں مگر ان لوگوں کو کبھی نہ بھولئے جو اپنے استادوں کے یا جو استادوں کے درجہ کے لوگ ہوں، استادوں کی صف کے لوگ ہوں یا آپ کے استادوں کے استاد ہوں ان کو یاد رکھئے یہ آپ کی شرافت کی بات ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ایک سبق یہ لیجئے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مجلس کا یہی پیغام ہے۔ دین کے پکے بنئے، فرائض کے پابند رہئے، وضع کے پختہ رہئے اور اپنے اصول کے پکے رہئے، یہ نہیں کہ جس ماحول میں گئے وہی اختیار کر لیا۔ کمیونسٹوں میں بیٹھے تو ویسی ہی باتیں کرنے لگے اور ملحدوں میں بیٹھے تو (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے الحاد کی باتیں کرنے لگے۔۔۔ اور روزہ خوروں اور نماز چوروں میں بیٹھے تو روزہ خوری اور نماز چوری شروع کر دی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس پیغام کو یاد رکھئے اور اس پر عمل کرنے سے ماسٹر صاحب کی روح کو ثواب پہونچے گا اس لئے کہ ان کے ذریعہ سے آپ کو یہ پیغام ملا ہے اور وہ اس پیغام کے عنوان ہیں۔ انشاء اللہ ان کے لئے ایصال ثواب ہوتا رہے گا اور دعائے مغفرت ہوتی رہے گی اس وقت بھی آپ دعا کریں ایک بار سورہ فاتحہ پڑھ کر اس کا ثواب پہنچائیں اور دعا کریں۔

انقلابی ایران کے بعض حقائق

ترجمہ، آفتاب عالم، فضیلت دوم

ایران کے ایک سُنی عالم کے ساتھ لیا گیا یہ انٹرویو ہم کویت کے ہفت روزہ "المجتمع" سے نقل کر رہے ہیں۔ پیش نظر انٹرویو میں جنوبی ایران میں بسنے والے سنی عربوں کے شاہنشاہی عہد اور انقلابی ایران کے زمانہ کے حالات وکیفیات کی نقاب کشائی کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ انٹرویو شیخ محمد بن محمد صالح ضیائی سے لیا گیا ہے، جن کا شمار ایران کے ممتاز سنی علماء میں ہے۔ موصوف شیخ بن باز کے ایک سعادتمند شاگرد، شہر "بندر عباس" کی جامع مسجد کے خطیب، اور تیرہ سال سے ایک معہد میں عربی واسلامی علوم کے استاذ ہیں۔ ابتدائی دینی تعلیم کے حصول کے لئے سب سے پہلے شہر "عوض" کے ایک سنی دینی مدرسہ میں "احمد فقیہی" کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، پھر دینی تعلیم کی تکمیل کے لئے سنہ ۱۹۶۰ء میں مدینہ منورہ چلے گئے اور سنہ ۱۹۶۳ء میں جامعہ اسلامیہ کا افتتاح ہوا تو انھوں نے جامعہ اسلامیہ میں داخلہ لیا جامعہ اسلامیہ سے سنہ ۱۹۷۰ء میں فراغت حاصل کی اور اس کے بعد ہی سے ایران میں سُنی مسلمانوں کی خدمت میں لگ گئے۔

یہ گفتگو جنوبی ایران کے ایک شہر "عوض" میں ایک نہایت سادہ سی عمارت میں ہوئی۔ جنوبی ایران میں بسنے والے سنی مسلمان دراصل عرب ہیں۔ بلوچی سنیوں کا قیام پاکستان کی سرحد پر بلوچستان کے علاقہ میں ہے۔ کردوں کا شمال مغربی ایران میں کردستان کے علاقہ میں۔ خراسانیوں کا روس وافغانستان کی سرحد پر اور ترکوں کا شمالی ایران میں۔ اس طرح یہ پانچوں سنی قومیں ایران کے چاروں کناروں پر آباد ہیں۔

شاہی دور کے بیشتر سنی طلبہ "کیونزم" سے متاثر تھے:

مجتمع: ہم شاہی دور کے ایرانی اہل سنت وجماعت مسلمانوں کے حالات جاننا چاہتے ہیں۔

شیخ ضیائیؒ: اسلامی انقلاب سے پیشتر سنی مسلمان واقعتہً لادینی زندگی گزارتے تھے۔ معاشرہ میں فساد وگمرہی کا دور دورہ تھا۔ شیعہ ہو سنی کوئی بھی شخص شاہ کی توجہ وعنایت سے بہرہ مند نہیں ہوسکتا تھا۔ شاہ کی ساری توجہات وعنایات فرقۂ بہائیہ کے ساتھ مخصوص تھیں جس کی وجہ سے سنیوں کو گزشتہ پچاس سالوں میں (خصوصاً رضا شاہ پہلوی کے دور میں) عظیم نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ مثال کے طور پر مسئلۂ "رفع حجاب" ہی کو لے لیجئے۔ غور فرمائیے کہ اس کی پاداش میں کتنے سنی خاندانوں کو اپنا محبوب وطن خیرباد کہہ کر خلیج کے مختلف دور دراز شہروں کی راہ دیکھنی پڑی۔ اس پر طرہ یہ کہ شاہی دور میں سنیوں کو کسی طرح کے اجتماعی حقوق حاصل نہ تھے۔ ان کے مدرسے برائے نام تھے۔ اس ستم ظریفی کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ "بندر لنجہ" جیسے ۹۹٪ سنی شہریوں پر مشتمل شہر میں محض ایک دینی درسگاہ تھی جس میں ائمہ مساجد وغیرہ تربیت حاصل کرتے تھے۔ مزید برآں اس مدرسہ کی کوئی سرکاری ضمانت بھی نہ تھی اور شہر "عوض" میں بھی صرف ایک دینی مدرسہ ہے جس کی مالیات کی فراہمی کی ذمہ داری کویت اور دیگر عرب ممالک کے محسن ومخلص کارکنوں کے سر ہے۔ شاہی حکومت نے جنوبی ایران کی ایک ہزار سنی مسجدوں میں سے کسی ایک مسجد کے بھی اخراجات کی ذمہ داری نہیں لی۔

سنیوں کو تعلیمی وتربیتی پہلو سے بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ یونیورسٹیاں قائم تو ضرور تھیں لیکن ایسے شہروں میں جن کے رنگ ڈھنگ اور وضع قطع پر شیعی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ شیعی طالب علم تو اسے دل کی آواز سمجھ کر وقت کے سانچے میں ڈھل جاتا تھا، لیکن سنی طالب علم کو دو صبر آزما مراحل میں سے کسی ایک کو طے کرنا پڑتا تھا یا تو وہ شیعی مذہب اختیار کرکے خلفاء راشدین، اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ کی توہین کرے اور ان کے بارہ میں نامناسب کلمات استعمال کرے اور سنی طالب علم اس لعنت میں گرفتار ہونے پر تیار نہیں۔ یا پھر اشتراکیت کے مادی نقطۂ نظر کو اپنا کر "سوشلزم" کا علمبردار بن جائے، (جیسا کہ آج کی صورت حال ہے) اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے مناسب تھا کہ ہر یونیورسٹی میں سنیوں کا کم سے کم چھوٹا سا کتب خانہ ہوتا اس طرح یونیورسٹی کے طلبہ کا رجحان کسی قیمت پر اشتراکیت کی طرف مائل نہ ہوتا۔ لیکن یہ کمی ہمیشہ محسوس کی گئی اور اسی کمی کے نتیجہ میں یونیورسٹی کے اکثر وبیشتر سنی طلبہ اشتراکی نظریات کے حامل ہوگئے۔ یہ وہ سب سے بڑا نقصان ہے جو ایرانی انقلاب سے پہلے سنی مسلمانوں کو پہنچا، اور انقلاب کے بعد اس کے بُرے نتائج ظاہر ہونا شروع ہوگئے۔

مذہب اہلسنت کی تائید وحمایت کے سلسلہ میں انقلاب نے کسی قسم کا اقدام نہیں کیا:

مجتمع: انقلاب کے بعد اہل سنت کے حالات میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی؟

شیخ ضیائیؒ: بعض جہالت سے تبدیلی ہوئی مثلاً سنی شہروں کی اجتماعی و اخلاقی خرابیوں کے اثرات پوری طرح سے زائل کئے گئے جس سے سنی مسلمانوں کو بہت فائدہ پہونچا لیکن جیسا کہ معلوم ہے کہ حکومت کا سرکاری مذہب شیعیت ہے اس لئے لازماً ذمہ داران حکومت اہل سنت وجماعت کے مذہب کی طرف توجہ نہیں دیتے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ دونوں فرقے اس شان سے رہیں کہ ایک قوم معلوم ہوں اور ان کے درمیان کوئی فرق وامتیاز نہ ہو، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کا شمار اسلام کی مایہ ناز اور مخلص شخصیتوں میں سے ہے اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دخول جنت سے شرف یاب ہوں گے اس کے برخلاف شیعہ (معاذ اللہ) انھیں جہنمی قرار دیتے ہیں۔ سنیوں کا عقیدہ ہے کہ علماء اسلام کا منصب ومقام اقتدار وقت کی رہنمائی ہے اور شیعوں کا خیال خام ہے کہ علماء دین کو نبیوں کا درجہ حاصل ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی طرح ان کا فیصلہ بھی قطعی وآخری ہے یعنی وشیعہ کے مابین اسی طرح اور بہت سے اختلافات ہیں تو پھر اتحاد واتفاق کہاں ممکن؟

اہلسنت کی کتابوں کی طباعت میں حکومت کی ہمت افزائی کا فقدان:

مجتمع: کیا انقلابی حکومت بذات خود سنیوں کے لئے دینی مدارس کے قیام اور تعمیر مساجد کا کام انجام دیتی ہے اور سنیوں کی دینی کتابوں کی نشر واشاعت کا موقع فراہم کرتی ہے؟

شیخ ضیائیؒ: حکومت نے سنیوں کے لئے ایک بھی مدرسہ نہیں کھولا۔ ہم نے "بندر عباس" میں خود ایک غیر سرکاری دینی مدرسہ کی بنیاد ڈالی لیکن حکومت نے اس میں کسی قسم کی دخل اندازی بھی نہیں کی۔ اسی طرح بلوچستان میں بھی متعدد دینی مدارس کا قیام عمل میں آیا انقلابی حکومت نے اس میں بھی کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان اندرونی وبیرونی خانہ جنگیوں کی وجہ سے دینی مدارس کے ساتھ حکومت کا موقف ورویہ ابھی تک کچھ واضح ہو کر سامنے نہیں آسکا ہے، لیکن اہل سنت کی دینی کتابوں کی حد تک تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کی اشاعت کے سلسلہ میں حکومت نے کسی طرح کی ہمت افزائی نہیں کی، جب کہ حکومت ان شیعی کتابوں کی نشر واشاعت میں بھرپور تعاون کر رہی ہے، جس میں خلفاء راشدین اور صحابۂ کرام پر سب وشتم اور اہل سنت کی مخالفت کی گئی ہے۔ یہ چیز ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ حکومت اہل سنت کی فلاح وبہبود میں کسی طرح کا حصہ لینا نہیں چاہتی۔

صحابۂ کرامؓ کے سب وشتم کا "انقلاب" پُرزور حامی ہے:

مجتمع: کہا جاتا ہے کہ بعض متعصب شیعوں کی جانب سے سنیوں کو بُری طرح تنگ کیا جارہا ہے جیسے ان کی مسجدوں کی بے حرمتی اور صحابۂ کرام پر سب وشتم۔ تو یہ کہاں تک صحیح ہے؟

شیخ ضیائیؒ: جہاں تک سنیوں پر دست درازی اور ان کی مسجدوں کی بے حرمتی کی بات ہے تو یہ بالکل بے بنیاد بات ہے، البتہ انقلاب کی ابتدا میں شہر "لنجہ" میں واقع ہونے والے شیعہ سنی فساد سے مسلمانوں کو کچھ گزند پہنچا اس کو

برانگیختہ کرنے میں دراصل بائیں بازو کے لوگوں کا ہاتھ تھا اور اس کے پس پردہ یہ سازش تھی کہ حکومت کو بعض اندرونی معاملات میں اُلجھا دیا جائے۔ اس میں ۷ شیعہ اور ۲۷ سنی کی جانیں تلف ہوئیں۔ اس فساد پر حکومت نے قابو پاکر معاملہ رفع دفع کردیا لیکن ابھی تک اس کی صحیح وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔ یہ جنوبی ایران کے حالات تھے۔ کردستان ہمارے جانے کا اتفاق تو نہیں ہوا لیکن یہ سننے میں کبھی نہیں آیا کہ وہاں کی کسی سنی مسجد پر تالا پڑ گیا ہو۔

اتنی بات تو بہرحال صحیح ہے کہ حضرت علی، حسن حسین اور ائمہ شیعہ کو چھوڑ کر بقیہ سارے صحابہ کی اہانت اور ان پر سب وشتم کی حکومت تائید کرتی ہے۔ انقلابی نمائندوں نے تو باقاعدہ بعض دیہاتوں میں ایسے رسائل تقسیم کئے جن سے صاف صحابہ کرام کی توہین اور ان کی شان میں گستاخی ہوتی ہے۔ ذمہ داران حکومت سے جب اس کی شکایت کی گئی تو محض سنی علاقوں میں ان رسائل کی تقسیم پر پابندی عائد کی۔ یہاں اس تلخ حقیقت کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ شیعہ برابر صحابہ کرام کو خائن وغدار، فاسق وفاجر، ملحد ولادین اور دوزخی وجہنمی قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابھی حال ہی میں رمضان سے قبل آیت اللہ خمینی نے ٹیلی ویژن پر آخری بات کہہ دی کہ "ماتم کی محفلیں سجاتے رہنا ابتدائے اسلام سے آج تک فرقۂ ناجیہ کا خاص شعار رہا ہے"۔ اس کا صاف مطلب یہ نکلا کہ جو گریہ وزاری اور آہ وبکا نہیں کرتے، سیاہ لباس نہیں پہنتے اور ماتم ونوحہ کی محفلیں نہیں سجاتے وہ غیر ناجی ہیں اس سے اشارہ آپؐ کے اس ارشاد کی طرف ہے۔ "تفترق امتی الی ثلاث وسبعین فرقۃ واحدۃ منھا ناجیۃ والباقی فی النار" (میری امت ۷۳ فرقوں میں منقسم ہوگی جس میں صرف ایک فرقہ ناجی ہوگا بقیہ سب کے سب ناری) یہ آیت اللہ خمینی کا اہل سنت کے جہنمی ہونے کا صاف فیصلہ ہے، شیعہ مذہب کی بنیادی کتابیں اس کی پوری تائید کرتی ہیں اور اس طرح کی کتابوں کی نشر واشاعت میں بھرپور تعاون کیا جاتا ہے۔

ایرانی دستور اور اہل سنت کے حقوق:

مجتمع: عالی جناب! ہماری خواہش ہے کہ آپ اس پر روشنی ڈالیں کہ جدید ایرانی دستور کے سلسلہ میں اہل سنت کے احساسات کیا ہیں۔ جس میں اہل سنت کو ذمیوں کا سا درجہ دیا گیا ہے اور ان کو صدارت اور وزارت عظمیٰ، خمینی کی قائم مقامی کرنے والی مجلس کی ممبری اور افواج کی سربراہی جیسے کلیدی عہدوں سے محروم کردیا گیا ہے۔

شیخ ضیائیؒ: جدید دستور کی رو سے بعض حقوق کی محرومی کی وجہ سے اکثریت "احساس کمتری" کا شکار ہے، وہاں کی اقلیت کا تو یہ خیال ہے (اور میں بھی انھیں میں سے ہوں) کہ جدید دستور میں جو بات پیدا ہوگئی ہے وہ بالکل فطری ہے۔ چنانچہ اکثریت کبھی اقلیت کو پورے حقوق نہیں دیتی۔ میرے خیال میں اگر ایرانی دستور میں شیعی مذہب کی توضیح وتصریح کردی جائے تو مسلمانوں کے مستقبل کے لئے ایک بہترین اقدام ہوگا کیونکہ اس صورت میں ایران کے اندر سب وشتم، لعن طعن، ماتم ونوحہ اور گریباں دری وغیرہ جو کچھ بھی ہوگا شیعی مذہب کے نام پر ہوگا نہ کہ اسلام کے نام پر، اس لئے کہ ان باتوں کا شیعہ مذہب کی تصریح کے بغیر محض اسلام کے نام پر ہونا کہیں زیادہ خطرناک ہوگا۔ میرے اس خیال کی امید ہے بہت سے علما تائید کریں گے۔

ایران میں حکومت اہل سنت کے اتحاد واتفاق کو پسند نہیں کرتی ہے:

مجتمع: عرب، کرد، ترک، بلوچ، اور بعض ایرانی اہل سنت کے درمیان کوئی متحدہ پلیٹ فارم بنانے کے سلسلہ میں کہاں تک اتحاد وتعاون پایا جاتا ہے؟

شیخ ضیائیؒ: افسوس ہے کہ اہلسنت میں کوئی اتحاد نہیں جو ان کے مشترکہ مسائل و مطالبات کے لئے انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرسکے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اہل سنت جغرافیائی حیثیت سے ایران کے مختلف خطوں میں بٹے ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے سے ہزاروں کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے جس کی وجہ سے ان کا آپس میں ملنا جلنا بہت مشکل ہے۔ اور اس کا دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ ان مختلف خطوں میں زبان اور مسائل کا بھی اختلاف ہے چنانچہ کردستان تقریباً ۵۰ سال سے آزادی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ جب کہ ایران کے سنیوں کا، اس قسم کا کوئی مطالبہ نہیں، بلوچستان کی اردو سے ملتی جلتی اپنی خاص زبان ہے ترکوں کی ترکی سے ملتی جلتی اپنی الگ زبان ہے، جنوب کے سنی اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کا کام فارسی زبان سے لیتے ہیں۔ یہاں یہ ذکر بیجا نہ ہوگا کہ مذہب اہل سنت کو نصف صدی سے حکومت کی تائید وحمایت نہ ملنے کی وجہ سے شریعت سے جہالت وناواقفیت عام ہے۔ اگر بعض قدیم مذہبی کتابیں ہیں بھی تو زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ ادھر ایرانی قافلۂ تہذیب سے پیچھے رہ جانے کا احساس سنیوں میں تیز سے تیز تر ہوتا جارہا ہے۔ اس تلخ حقیقت کا مشاہدہ سنیوں کے شہر "عوض" کے قریب ہونے والے دو شیعہ شہر "جہرم" اور "لار" میں کیا جاسکتا ہے۔ اہالیان جہرم و لار اپنے نونہالوں کو دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے "قم" و "مشہد" بھیجتے ہیں۔ یہ نونہالان شیعہ وہاں سے "حجۃ الاسلام" بن کر نکلتے ہیں، اور شیعہ مذہب کے دقائق وغوامض کی تشریح اور اس کے معارف وحقائق کی گرہ کشائی کرتے ہیں اور ہماری پوزیشن یہ ہے کہ ہمارے پاس نہ تو دینی ادارے ہیں اور نہ ہی علمی مراکز ہم نے اپنے طلبہ کو "عوض" سے مدینہ یونیورسٹی بھیجنے کا ارادہ کیا بھی تو نہایت تاخیر سے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے سنیوں میں یکجہتی مفقود ہے۔ ویسے یوں بھی حکومت سنیوں کے اتحاد واتفاق کا خیر مقدم نہیں کرتی۔ اس کی سب سے واضح مثال یہ ہے کہ محمد علی رجائی کی وزارت عظمیٰ اور بنی صدر کی صدارت کے عہد میں ایران کے تمام علمائے سنت کو تہران میں ایک علمی کانفرنس کے انعقاد کی دعوت دی گئی۔ اس کانفرنس نے علماء سنت کی ایک ایسی خاص مجلس کی تشکیل کا حکومت سے مطالبہ کرنے کے لئے قرارداد بھی پاس کی جو کہ حکومت کے تمام شعبہائے وزارت کے دینی امور کی سرپرستی کا کام انجام دے اور ہر نشیب و فراز میں سنیوں کا مرجع ہو، لیکن ان تمام کوششوں پر رجائی نے یہ کہہ کر پانی پھیر دیا کہ "ایسا کبھی نہیں ہوسکتا، یہ مجلس حکومت کی ترقیوں کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگی"۔ اس طرح کانفرنس کی یہ پاس شدہ قرارداد تشنۂ تکمیل رہ گئی کیونکہ رجائی کی نظر میں یہ مجلس خرمن امن وامان کے لئے برق بے اماں کے مرادف تھی۔

سلطان العلماء اور حکومت ایران:

مجتمع: عالی جناب! سلطان العلماء شیخ محمد علی نے دبئی پہنچ کر دوبارہ تہران واپس آنے کا ارادہ کیوں ترک کردیا، ان کا کیا واقعہ ہے؟

شیخ ضیائیؒ: میرے خیال میں سلطان العلماء کو بعض سیاسی امور میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہئے اور بائیں بازو کے نوجوانوں نے جو باتیں ان تک پہنچائی تھیں ان پر یقین بھی نہیں کرنا چاہئے تھا۔ چنانچہ سنا گیا کہ شیخ عزالدین کردی کی حمایت میں (جو اس وقت حکومت سے برسرپیکار تھے) شیخ سلطان نے ایرانی دستور پر ووٹ دینا حرام قرار دیا۔ ساتھ ہی ان کے لئے ایران چھوڑنا بالکل مناسب نہ تھا اگر اسکے بعد بھی وہ واپس آجاتے تو شاید قتل کی نوبت نہ آتی اور حسب سابق ان کو اپنی سرگرمیوں کے جاری رکھنے کا موقع ملتا۔

شیخ تن تنہا دبئی ہوتے ہوئے مقیم ہوگئے پھر "لنجہ" میں فتنہ برپا ہونے پر لوگوں کے خوف دلانے سے بغیر کسی سبب کے اپنے اہل وعیال کو بھی بلالیا، لیکن میرے اطمینان دلانے پر وہ "لنجہ" واپس آگئے یہاں ان کا پانچ ماہ قیام رہا۔ اس دوران حالات بھی سازگار ہوگئے۔ لیکن پھر شیخ کو ایران سے کوچ کرنے کا خیال پیدا ہوا کیونکہ وہ اس ماحول سے کچھ اکتا سے گئے تھے اور اب وہ دبئی پہنچ کر آرام کرنا چاہتے تھے۔ خیر جو ہوا سو ہوا! اب بھی شیخ کو ایران واپس آنے کا پورا موقع حاصل تھا بلکہ میں نے تو بچشم خود حالیہ رئیس جمہوریہ "علی خامنئی" کا خط دیکھا جس میں انھوں نے شیخ کو ایران واپس آنے کی دعوت دی تھی تاکہ وہ آکر ملک وملت کی خدمات انجام دیں۔ ایرانی ذمہ داروں کا بھی یہی کہنا ہے کہ شیخ نے ایران سے بذات خود کوچ کیا اس میں کسی کے ارادہ کا دخل نہیں تھا اس لئے مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ ان کو واپس بلانے کے لئے وفد نہ بھیجا جائے، کیونکہ خود شیخ کے مؤیدین نے وفد روانہ کرنے کی تجویز مسترد کردی تھی، ہم نے بھی اس سلسلہ میں شیخ کے مؤیدین کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے ان کو واپس بلانے کے لئے وفد بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی۔ اس لئے کہ میرے خیال سے اس وقت ان کے لئے کوئی خطرہ نہ تھا، بفرض محال اگر خطرہ تھا بھی تو موت سے بھاگنا کہاں کی منطق ہے؟ اور اپنے منصب سے سبکدوش ہوئے بغیر ذمہ داریوں کا جوا اتار پھینکنا کیا فلسفہ ہے؟ یہ تو بڑی نازیبا بات ہے کہ محض موت کے ڈر سے واپسی کا ارادہ ترک کردیا جائے خدا کا ارشاد ہے، "وما کان لنفس أن تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا" ان کا موت سے ڈر کر ایران واپس نہ آنا دراصل ان کے دامن میں ایک بدنما داغ ہے۔ ہداہ اللہ وإیانا۔

شاہ کا تختہ الٹنے میں سنیوں کا کردار:

مجتمع: شاہ کے اقتدار کو ختم کرنے والے ایرانی انقلاب میں سنیوں نے کیا رول ادا

کیا ۔؟

شیخ ضیائیؒ: شاہی حکومت کا خاتمہ کرنے میں سنیوں نے کوئی رول نہیں ادا کیا، انقلاب کی قیادت کرنے والے شیعی علماء تھے اور شیعی علماء سے سنیوں کی بیزاری مسلم ہے، وہ سنی نوجوان جنھوں نے شاہ کے نکلنے سے پہلے اور شاہ کے نکلنے کے بعد انقلاب کی حمایت و تائید میں کسی طرح کا ہاتھ بٹایا ان کا انتساب بائیں بازو کی سوشلسٹ جماعت سے تھا، اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اہل سنت شاہ کا تعاون کرتے تھے، شاہ تو شیعی مذہب کا مروج تھا تو سنی اس کی حمایت کیونکر کر سکتے تھے۔ البتہ اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ اہل سنت ہونے کی وجہ سے شاہ کے رعب و دبدبہ سے ہمیشہ دہشت زدہ رہتے تھے، اور ہمیشہ ان کو یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں انقلاب کے ناکام ہونے پر اقلیت ہونے کی حیثیت سے وہ شاہ کے پنجۂ استبداد کا نشانہ بن جائیں اس ڈر سے سنی ہمیشہ چاق و چوبند رہتے تھے، حتی کہ آج بھی شیعہ اور سنیوں کی ایک کثیر تعداد کو حکومت کے ڈانواڈول ہونے اور اشتراکیوں کے از سر نو اقتدار و تسلط کا خوف برابر دامنگیر رہتا ہے۔ جبکہ اہل سنت کا یہ خیال ہے کہ شیعی علماء کو سنیوں کی خدمت سے مطلق سروکار نہیں اور امر بالمعروف، نہی عن المنکر، برائیوں کی روک تھام اور پردہ وغیرہ کی حمایت سے شیعوں کا مقصود قطعاً سنیوں کی حمایت نہیں بلکہ ان کی یہ ساری تگ و دو اس لئے ہے کہ خود ان کا مذہب اس کا مؤید ہے۔

سنیوں کی اقتصادی ناکہ بندی:

مجتمع: کیا حکومت سنی اور شیعی علاقوں کی خدمت میں کسی طرح کا فرق و امتیاز برتتی ہے؟

شیخ ضیائیؒ: حکومت کا دامن اس ناانصافی سے پاک ہے یا نہیں؟ یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض ذمہ داران حکومت محض اپنی غرض کی خاطر اس سلسلہ میں بدعملی سے کام لیتے ہیں جیسا کہ یہ بات جزیرہ "قشم" اور بعض ان سنی جزیروں میں دیکھنے میں آئی ہے جن میں بعض سنیوں کی حکومت نے جنوبی و شمالی خلیج کے سارے تجارتی روابط ختم کر کے "اقتصادی ناکہ بندی" شروع کر دی ہے۔ محض یہ جان کر کہ ان جزیروں میں بسنے والے ۹۰٪ سنی ہیں، اور بعض اشخاص پر کچھ سنی مسلمانوں کو دبئی سے "بندر عباس" منتقل کرنے کے ۲ سالہ قبل جرم پر ابھی تک مقدمہ چل رہا ہے، لیکن بظاہر ان سارے اقدامات کے پس پردہ مفاد پرست اور نفع خور ذمہ داران حکومت کا ہاتھ ہے۔ حکومت کا اس میں کچھ دخل نہیں۔

خرافات کا مقابلہ اور قبوں کا منہدم کرنا ممکن نہیں:

مجتمع: بدعات و خرافات، اولیاء و صالحین کے مزارات اور سنی مسلمانوں کی قبروں پر قبوں کی تعمیر کا مقابلہ کرنے میں سنی مسلمان علماء کا کیا کردار ہے؟

شیخ ضیائیؒ: بدعات و خرافات اور وہم و گمان کے ماحول سے پنجہ آزمائی بالکل ممکن نہیں کیونکہ اولاً تو شیعہ مذہب کی بنیاد ہی قبروں کی تعظیم اور اس کے تقدس پر ہے اور ثانیاً شیعی مذہب کو حکومت کی تائید و حمایت حاصل ہے اس لئے بدعات و خرافات کے خلاف آواز اٹھانا دراصل حکومت سے عداوت مول لینے کے مرادف ہے، آپ خود غور فرمائیں کہ سعودیہ میں قبوں کو کس نے منہدم کیا؟ اور قانون کون نافذ کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ حکومت۔ اس لئے میری سمجھ سے سنی علماء جنوبی ایران میں قبوں کی تعمیر اور بدعات و خرافات کے مقابلہ سے قاصر ہیں۔ البتہ حکومت اس کام کو تن تنہا انجام دے سکتی ہے، اس سلسلہ میں باہمی تفاہم بھی اہم کردار ادا کر سکتا ہے لیکن افسوس کہ علماء کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔

سنی نوجوانوں کا سوشلسٹ ہو جانا ان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے:

مجتمع: کیا سنیوں کی کوئی اسلامی تحریک مغربی و اشتراکی رجحانات سے محفوظ رکھنے اور اسلام اختیار کرنے کی دعوت کا کام انجام دے رہی ہے؟

شیخ ضیائیؒ: الحمد للہ ہمارے سنی معاشرہ کی فضا دینی ہے اور نوجوانوں کے رجحانات و خیالات اسلامی ہیں، ان پر مغربی رجحان کا مطلق اثر نہیں البتہ ہمارے سنی نوجوان بائیں بازو کی اشتراکی جماعت کے نظریات سے متاثر ہیں اور یہ سب کچھ شاہ کے دور کی ایرانی یونیورسٹیوں کا کرشمہ ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس وقت وہ مخلص داعی نہیں جو اس بلاخیز طوفان کو روکنے کے لئے ایک آہنی محاذ بنائیں۔ کتنے عار کی بات ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ "سرخ اشتراکیت" کا علمبردار اور روسی بالشویک تحریک کا حامی ہو جس کی افغانستان میں خون آشامیوں اور زہر چکانیوں سے کوئی ناواقف نہیں۔

وسائل کی قلت:

مجتمع: جناب عالی! اس سلسلہ میں آپ کا کیا کردار ہے؟

شیخ ضیائیؒ: بندر عباس میں ہمارا ۳۰۰ طلبہ پر مشتمل ایک دینی مدرسہ ہے اسی طرح میں ایک ثانویہ میں علوم عربیہ کا مدرس ہوں۔ جمعہ کے روز بندر عباس میں عربی و فارسی میں خطبہ دیتا ہوں، اور مسلمانوں کے دینی احکام کی تشریح اور ان کے شب و روز کے مسائل کا حل پیش کرتا ہوں، لیکن وسائل کی قلت کی وجہ سے اس خدمت کو کما حقہ انجام دینے سے قاصر ہوں۔

میں ہمیشہ "حافظ اسد" پر حملے کیا کرتا ہوں:

مجتمع: کہا جاتا ہے کہ حکومت ایران آپ کو تنگ کرتی ہے حتی کہ اس نے آپ کو مسلسل دو بار حج سے روک دیا یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟

شیخ ضیائیؒ: یہ بات صحیح نہیں، کیونکہ مجھے یاد ہے کہ میں نے جب بھی کسی حاکم کا ذکر شر کے ساتھ کیا تو حافظ اسد کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا، لیکن حکومت ایران نے ان کی حمایتی ہونے کے باوجود مجھ سے کسی طرح کی باز پرس نہیں کی، بلکہ مزید برآں میرے طلبہ کے لئے بغیر کسی قید و بند کے ایک ماہانہ خطیر رقم کی پیشکش بھی کی لیکن میں نے مستقبل میں برے نتائج کے ڈر سے اس پیشکش کو رد کر دیا۔

بمبئی میں
خالص گھی اور میوہ جات سے بھرپور
مٹھائیاں اور حلویات
عمدہ و لذیذ
سلیمانی افلاطون
اس کے علاوہ خصوصی پیشکش
ڈرائی فروٹ برفی
بلک کیک • قلاقند • ملائی • برفی • کوکو ملائی برفی
ہر قسم کے تازہ و خستہ
بسکٹ
اور
نان خطائیاں
خریدنے کا قابل اعتماد مرکز
سلیمان عثمان مٹھائی والے
مینارہ مسجد کے نیچے، بمبئی فون 320059
بیکری: — ۳۳ - محمد علی روڈ بمبئی - ۳

اسلامی بینک — ایک جائزہ

بنبیہ عبد ربہ — ترجمہ: محمد اکرم ندوی

چند سالوں سے عالم اسلامی میں ایک ہمہ گیر اسلامی بیداری پھیل رہی ہے اور مسلمانوں کے سکون و اطمینان کو غارت کرنے والی چیزوں پر پابندی عائد کرنے اور ان کی زندگی کی تشکیل جدید کے لئے عالمی پیمانہ پر کوششیں کی جا رہی ہیں، گذشتہ صدی کے دوران مسلمانوں اور ان کے کامیاب اسلامی نظام کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر کے ان پر خود ساختہ خارجی نظام مسلط کر دئے گئے تھے، اس عرصہ میں ان مشرقی و مغربی نظاموں کا تجربہ کر کے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ان نظاموں نے ان کو کسی قسم کا سکون و اطمینان نہیں بخشا، بلکہ ان کو فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیا اور خالق کائنات سے بالکل دور کر دیا لیکن رفتہ رفتہ ان کے اندر دنیا و آخرت دونوں کی فلاح و بہبود کے ضامن اسلام کے مکمل نظام زندگی کی طرف رجوع کرنے اور اپنی دیرینہ غلطی کی تلافی کرنے کا خیال پیدا ہوا، لیکن اسلام کی طرف واپسی کے راستہ میں پھول نہیں بچھے ہوئے تھے، یہ راستہ خاردار، اور خطرات سے پر تھا، یہ خطرات مسلمانوں کو عقیدہ اور تہذیب دونوں سطحوں پر چیلنج کر رہے تھے، اس کے نتیجہ میں انکے اندر سخت رد عمل پیدا ہوا، اور انھوں نے نت نئے اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی مسائل کے حل کے لئے صحیح اور متبادل نظام کی تلاش و جستجو شروع کر دی۔

ابتداءً بعض کوششیں ایسی کی گئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی نظام اور غیر اسلامی نظاموں کے درمیان مصالحت کر لی جائے اور ان غیر اسلامی نظاموں کے نئے تجربات اسلامی نظام کے اندر شامل کر دئے جائیں، لیکن اسلام کی طرف مستقل واپسی کی ضرورت کا احساس بڑھتا رہا اور لوگوں نے یہ طے کر لیا کہ ان غیر اسلامی نظاموں کو بالکلیہ مسترد کر دیا جائے، اسلامی نظام اور غیر اسلامی نظاموں کے درمیان مصالحت کی کوشش و تحریک کو ٹھکرا دیا جائے اور معاشرہ کے اندر صحیح اسلامی نظام نافذ کیا جائے۔

اعداء اسلام نے اسلام کے اقتصادی نظام کو زندگی کے اسٹیج سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہ تہمت لگائی کہ اسلامی نظام نئی تہذیب کا ساتھ نہیں دے سکتا اور ایک مدت تک مسلمان اس افتراء پردازی کا شکار رہے، لیکن یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ انسانی اور مادی نظام بالخصوص مسلمانوں کے لئے سعادت اور استحکام مہیا کرنے میں ناکام ہیں تو مسلمانوں کو فکر لاحق ہوئی کہ ایک ایسا متبادل اقتصادی نظام تلاش کریں جس سے وہ ایک مستحکم اور پرسکون زندگی بسر کر سکیں اور مخلص مسلمان ایسے اسلامی اداروں اور جماعتوں کی تشکیل کی طرف متوجہ ہو گئے جو اسلام کے اقتصادی نظام کو عملاً نافذ کر سکیں اور دنیا کے سامنے ثابت کر دیں کہ اس نظام کے اندر انسانی مسائل کو حل کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

اس صدی کی ساتویں دہائی میں مقامی سطح پر مختلف اسلامی ادارے اور بینک قائم کئے گئے، اگرچہ یہ تجربہ بالکل ابتدائی ہے، لیکن آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ ان اسلامی اداروں نے کافی حد تک کامیابیاں حاصل کر لی ہیں اور تمام درپیش چیلنجوں کا بآسانی مقابلہ کر رہے ہیں۔

اسلامی بینک: بینک ایسا مالیاتی ادارہ ہے جہاں منافع کی غرض سے سرمایہ جمع کیا جاتا ہے پھر اسے تجارتی جگہوں میں لگایا جاتا ہے، بینک کا منافع بنیادی طور پر سرمایہ جمع کرنے والوں اور اس سے تجارت کرنے والوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے۔ اسلامی بینک ایسا مالیاتی ادارہ ہے جس میں شریعت اسلامیہ کے مطابق سرمایہ جمع کیا جاتا ہے اور اس سے تجارت کی جاتی ہے، اس بینک کا مقصد ایسے معاشرہ کی تعمیر ہے جس کے اندر ہر فرد دوسرے کا ضامن ہو، افراد کے درمیان مال کی صحیح تقسیم ہو اور اسلام کی ہدایت کے مطابق مال خرچ کیا جائے، اسلامی بینک میں جامد سرمایہ کو حاصل کر کے اس سے تجارت کیجاتی ہے اور نفع و نقصان میں اشتراک ہوتا ہے۔

اسلامی اور سودی بینکوں کا فرق:

اسلامی اور سودی بینکوں کے درمیان مقصد، وسیلہ اور نتیجہ کی حیثیت سے بنیادی فرق ہے۔

مقصد کا فرق: اسلامی بینک کی بنیاد زندگی اور انسان کے سلسلہ میں اسلامی تصور پر ہے، اور وہ تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین کا خالق ہے، اس نے انسان کو خلیفہ بنایا ہے، اور اس کے رزق کا ضامن ہے، خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ ان شرائط کا لحاظ کرے جو اس پر اس کے آقا و مالک نے عائد کی ہیں، انسان اپنے رب کی اطاعت کرے، احکام کو بجا لائے منہیات سے اجتناب کرے، جبکہ سودی نظام زندگی کے مادی تصور پر قائم ہے کہ ہر شخص اپنی طاقت بھر کام کرے اور اپنی محنت کا پھل لے، مالی معاملات میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں ہے، یہاں خیانت ایک ہنر ہے، رشوت تجارتی معاملہ ہے، چوری ذہانت و مہارت کا کام ہے، سودی نظام کا تصور یہ بھی ہے کہ انسان زمین کا مالک ہے، مال حاصل کرنے اسے بڑھانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے وسائل و ذرائع اختیار کرنے میں آزاد ہے، کسی بھی آسمانی نظام کا پابند نہیں ہے، اگر مقصد صحیح ہے تو ذرائع و وسائل پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

ذرائع کا فرق: سودی بینکوں میں مال متعین نفع پر جمع کیا جاتا ہے، اور یہ جمع شدہ مال تجارتی منصوبوں پر لگایا جاتا ہے، خواہ یہ تجارتی منصوبے کامیاب ہوں یا ناکام، جب کہ اسلامی بینکوں میں مال جمع کرنے کے بعد اس سے تجارت کی جاتی ہے اور نفع و نقصان دونوں میں اشتراک پر معاہدہ ہوتا ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ سودی بینکوں میں متعین منافع متعین وقت پر ملتا ہے، لیکن اسلامی بینکوں میں تجارتی منصوبہ کی تکمیل سے پہلے کسی قسم کی تعیین و تحدید نہیں ہو سکتی ہے۔

نتیجہ کا فرق: سودی نظام ایک ایسے اجتماعی نظام کو جنم دیتا ہے جسکی بنیاد استحصال، احتکار اور مال بڑھانے کے جذبہ پر ہے، اس نظام میں مال صرف چند لوگوں کے پاس جمع ہو جاتا ہے جو اپنے آپ کو متحد کر کے مزدوروں اور فقراء کا استحصال کرتے ہیں، اس نظام میں حقیقی اقتدار کچھ ظالموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، لیکن اسلامی نظام میں حتی الامکان مال کی صحیح تقسیم کی کوشش کی جاتی ہے (کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم) اسلامی نظام میں فقراء اور مالداروں کے درمیان تعلق کی بنیاد اخوت، تعاون اور محبت پر ہوتی ہے، اس میں حقیقی اقتدار اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے، کسی بھی انسانی فرد یا جماعت کو اس طرح کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔

اسلامی بینکوں کی کامیابی:

اسلامی بینک ابھی ابتدائی مرحلے گزر رہے ہیں اور تجربہ کی منزل طے کر رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان بینکوں نے کمیت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے کافی کامیابی حاصل کر لی ہے۔

اسلامی بینکوں کا اجمالی نقشہ یہ ہے:

(۱) جدہ کا ترقیاتی اسلامی بینک (۲) دبئی کا اسلامی بینک (۳) بحرین کا اسلامی بینک (۴) کویت کا فائننسنگ ہاؤس (۵) قاہرہ کا فیصل اسلامی بینک (۶) خرطوم کا فیصل اسلامی بینک (۷) اردن کا اسلامی بینک (۸) قاہرہ کا ترقیاتی سرمایہ کا بین الاقوامی بینک (۹) قاہرہ کا اسلامی بینک (۱۰) لکسمبرگ کا بین الاقوامی بینک۔

شارقہ کی اسلامی کمپنی آف انوسٹمنٹ نے سوئزرلینڈ میں ایک اسلامی بینک کھولنے کی تجویز پاس کی ہے۔ جنرل سکریٹری آف اسلامک بینکس نے کہا ہے کہ ملیشیا اور جنیوا میں دو اسلامی بینک کھولنے کی تجویز ہے اور قطر میں ایک اسلامی بینک کی تعمیر ہوئی ہے جو عنقریب اپنی کارروائی شروع کر دیگا۔ قاہرہ کے فیصل اسلامی بینک نے سنہ ۱۴۰۰ھ کی اپنی سالانہ رپورٹ میں کہا ہے کہ اسیوط، اسکندریہ اور ازہر میں اس بینک کی شاخیں کھولی جائیں گی، اور سنہ ۱۴۰۳ھ میں اس کی شاخیں طنطا، سوئز اور مصر جدیدہ میں کھولی جائیں گی، اردن کے اسلامی بینک نے

سوال و جواب

محمد طارق ندوی

سوال: ماہ محرم کا تاریخی پس منظر کیا ہے، اس کی ابتدا کیسے ہوئی، اس کی اہمیت کیا ہے، اسی طرح اور دوسرے مہینوں کی کیا اہمیت ہے اور کس لئے مشہور و معروف ہیں۔

جواب: عربی سال کا ابتدائی مہینہ محرم ہے اور آخری ذی الحجہ یہ قدیم زمانہ (زمانۂ جاہلیت) سے انھیں ناموں کے ساتھ چلے آرہے ہیں، اہل عرب نے مہینوں کے نام موسم یا اور کسی وجہ سے رکھ لئے تھے۔ مثلاً محرم اس لئے کہ اس میں جنگ کرنا حرام سمجھتے تھے اور شہر اس لئے کہ اشہر (ایک خاص قسم کا پودا ہے) اس زمانہ میں بھوتا تھا اور جیسے ذی الحجہ اس لئے کہ حج اسی ماہ میں ہوتا تھا، اور ذی قعدہ اس لئے کہ یہ زمانہ فراغت کا ہوتا تھا، مثلاً رجب اس لئے کہ اس کے معنی عظمت کے ہیں، اس مہینہ میں ایک خاص قسم کی قربانی انھوں نے فرض کر رکھی تھی جس کی وجہ سے اس ماہ کو عظمت حاصل تھی، اسی کے ساتھ کبھی اہل عرب اپنی ضرورت کے لحاظ سے مہینوں میں تقدیم و تاخیر کر دیا کرتے تھے، مثلاً ان کو محرم میں جنگ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس میں جنگ کر لی اور محرم کو دوسرا مہینہ قرار دیدیا، اسلام نے ان مہینوں کو تو باقی رکھا مگر حجۃ الوداع کے موقعہ پر آنحضرتؐ نے اس تقدیم و تاخیر کو ممنوع قرار دیدیا، اور تقدیم و تاخیر سے جو فرق پیدا ہو گیا تھا اس کو ختم کر دیا۔

سوال: ماہ محرم میں حضرت حسینؓ کی محبت کے گمان میں تعزیت اور تعزیہ داری کا شرعاً کیا حکم ہے اور اس کی کیا اصل ہے؟

جواب: ماہ محرم میں حضرت حسینؓ کی محبت کے گمان میں تعزیت اور تعزیہ داری بدعت ہے، فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ہر سال حضرت حسینؓ کی تعزیت کی جاتی ہے یہ مکروہ تحریمی ہے اصلاً ماہ محرم میں تعزیت اور تعزیہ داری روافض کی ان بدعات میں سے ہے جو ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں، اس کی اسلام میں کوئی اصل نہیں ہے۔

سوال: بغیر اعتقاد کے محض تماشائی طریقہ پر تعزیہ دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: تعزیہ داری بدعت ہے اور بدعت کے کام کو خواہ تماشائی طریقہ پر ہو نہ دیکھنا چاہیے بلکہ بدعت کے ہر کام کو اولاً ہاتھ سے اور نہیں تو زبان سے رد کرنا چاہئے، اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ دل سے نفرت کرنا چاہئے اور یہ سب سے ضعیف درجہ کے ایمان کی علامت ہے۔ حدیث شریف میں یوں آتا ہے:

من رأی منکم منکرًا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ و ان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف الایمان۔

سوال: تعزیہ سے مراد مانگنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جائز نہیں کیونکہ مراد مانگنا صرف اللہ رب العالمین سے درست ہے غیر اللہ سے نہیں۔ بلکہ تعزیہ یا کسی غیر اللہ کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ خود مراد پوری کر سکتا ہے تو یہ کفر ہے اور حقیقتاً تعزیہ سے مراد مانگنا جہالت ہے کیونکہ تعزیہ تو ڈھانکنے والے کی بات سن سکتا ہے اور نہ اس کی حالت دیکھ سکتا ہے اور نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

سوال: سلام کرتے وقت ہاتھ اٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: سلام کرتے وقت ہاتھ نہ اٹھانا چاہئے۔ ہاں اگر سامع دور ہو یا کم سنتا ہو تو سلام کی آواز کے ساتھ ہاتھ اٹھا سکتے ہیں۔

سوال: محرم شریف میں مرثیہ خوانی میں شرکت جائز ہے یا نہیں؟

جواب: مرثیہ خوانی میں شرکت ناجائز ہے کیونکہ اس کی بنیاد شریعت کی منع کردہ چیزوں اور خلاف شرع باتوں پر ہے۔

سوال: جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ تعزیہ بنانا سنت ہے ایسا شخص شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

جواب: وہ جاہل، خطاوار مجرم ہے۔ تعزیہ سازی بدعت ہے اور بدعت کے بارے میں صاحب شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح فرمان ہے، کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار"۔ ایک اور دوسری حدیث شریف میں ہے، "شر الامور محدثاتھا وکل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ"۔ اور اسی طرح حدیث میں ایک جگہ یوں وارد ہے، "ایاکم و محدثات الامور"۔ اور قرآن بھی ایسی چیزوں کے بارے میں صاف اعلان کرتا ہے، لا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ ان صریح ارشادات کی روشنی میں غور کرنے سے صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تعزیہ کا بنانے والا رکھنے والا اس میں کسی قسم کی مدد کرنے والا جہ جائیکہ راہ حق پر ہو عند اللہ شاب ہو بلکہ وہ راہ حق سے دور اور گنہگار اور مجرم ہے۔

سوال: اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ فلاں بزرگ ہر مقام سے ندا دینے والے کی آواز سن لیتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب: یہ عقیدہ اہل اسلام کے عقائد کے خلاف اور مشرکین کے عقائد کے موافق ہے۔ ہر شخص کی ندا کو ہر جگہ سے اور ہر وقت سننا یہ صرف پروردگار عالم کے ساتھ خاص ہے اور کسی مخلوق میں یہ صفت نہیں۔

سوال: حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ علیہ السلام کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: علیہ السلام کا لفظ انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہے۔ رضی اللہ عنہم کا لفظ صحابۂ کرام کے ساتھ خاص ہے۔ اب اگر کوئی غیر صحابہ کے ساتھ رضی اللہ عنہم کے الفاظ استعمال کرے تو اگرچہ لفظی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں مگر چونکہ یہ اصطلاح بن چکی ہے اس لئے غیر مناسب ہے، اسی بنا پر حسینؓ کے لئے بھی رضی اللہ عنہ کہنا چاہیئے۔

بقیہ ص ۳

ڈگری بھی رکھتے تھے، اس مضمون پر ان کے مضامین بھی شائع ہوئے ہیں اور انگریزی میں انھوں نے تصنیفات بھی کی ہیں، جو انکے مضامین اور اشعار کے علاوہ ہیں۔

ماسٹر صاحب کا تحریری کام عموماً اسلامی موضوعات پر ہوتا تھا، اور ان کو اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیمات و افکار سے گہرا تعلق تھا، ان سے دلچسپی لینے اور ان کو تقویت پہونچانے سے دلچسپی تھی۔

اسی کے ساتھ ساتھ طلباء کی علمی و ثقافتی ترقی سے خصوصی دلچسپی تھی، چنانچہ طلبہ کی انجمن الاصلاح، کے جلسوں اور علمی مقابلوں میں بحیثیت صدر یا حکم یا صرف عام شریک کے برابر شرکت کرتے اور طلباء کی علمی دلچسپیوں سے اپنی توجہ کا مظاہرہ کرتے تھے، طلباء بھی اپنے تمام علمی جلسوں میں اہتمام کے ساتھ ان کو مدعو کرتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے۔ ماسٹر صاحب بڑے اچھے انسان تھے، سب تعلق والوں کی سرتوں سے مسرور اور تکلیفوں سے ملول ہوتے، اور سب اہل تعلق سے بڑے انس و تعلق کا معاملہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی رحلت سے ان کے حجین نے ایک ایسا خلاء محسوس کیا جس کو عرصہ تک یاد رکھا جائیگا۔

ماسٹر صاحب کے پسماندگان میں چار صاحبزادے ہیں۔ پروفیسر وحید احمد صدیقی شاہجہانپور، ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی نیو یارک، ڈاکٹر رضی احمد صدیقی مقیم لیبیا، ان میں سے ڈاکٹر مطیع سرجن ہیں، باقی صاحبزادگان پی۔ ایچ۔ ڈی اور یونیورسٹیوں میں ریڈر و پروفیسر ہیں۔ ماسٹر صاحب کی اہلیہ بھی جو پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم اور ماسٹر نیاز احمد صدیقی کی ہمشیرہ ہیں۔

ہم بارگاہ خداوندی میں دعاگو ہیں کہ ماسٹر صاحبؒ کو اپنے یہاں عفو و مغفرت اور رفیع درجات کے انعامات سے بیش از بیش نوازے اور ان کے حجین کو انکے اچھے کاموں کی تقلید کی توفیق عطا کرے آمین۔

تصحیح

گذشتہ شمارہ میں "اسلامی فکر اور تہذیب کا اثر ہندوستان پر" کی ترتیب کاپی جوڑنے میں بدل گئی تھی، براہ کرم صفحہ ۱۴ کے بعد ۱۷-۱۶-۱۵ پڑھیں۔

طلبہ کا صفحہ

محرم الحرام کی فضیلت

اور یوم عاشورہ کا روزہ

نیاز احمد بستوی ندوی

★

اصل بات یہ ہے کہ کوئی مہینہ کوئی دن یا سال بذات خود مسعود یا منحوس نہیں ہوتا ہے بلکہ جو سال یا ماہ اچھے کارناموں اور اچھے واقعات میں گزر جائیں وہ مسعود اور جو سال یا ماہ برے اور دلخراش واقعات میں گذر جائیں وہ نامبارک اور منحوس مانا جاتا ہے۔ منجملہ اور مبارک مہینوں کے ایک مہینہ محرم الحرام کا بھی ہے جو اس وجہ سے مبارک اور مسعود مانا جاتا ہے کہ اس ماہ میں بہت سے خوشکن اور اچھے واقعات رونما ہوئے ہیں تاریخ اسلام بلکہ تاریخ انسانی میں اس کی بڑی عظمت اور اہمیت رہی ہے، اس مہینہ کو عظمت اور اہمیت اس وقت سے حاصل ہے جبکہ حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور نہ انکی شہادت کا وہ دلسوز واقعہ ہی پیش آیا تھا" جس کو اسلاف نے کیا بھی ہے۔ لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس ماہ کی عظمت بھی ختم ہو گئی نہیں بلکہ اس کی عظمت اور اہمیت بہر حال برقرار ہے اور تا قیامت باقی رہے گی۔ اس عظمت پر تو لفظ محرم خود دال ہے جو اس کی فضیلت کے لئے کافی ہے۔

آقائے نامدار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ماہ کی فضیلت بیان فرماتے ہوئے فرمایا ہے کہ رمضان المبارک کے بعد سب سے افضل روزے محرم کے مہینہ کے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ رمضان شریف کے بعد کس ماہ کے روزے رکھوں تو آپؐ نے فرمایا کہ محرم کے روزے رکھو، طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ محرم کے ہر روزے کا ثواب ایک ماہ کے روزے کے برابر ہے، اس کے علاوہ جتنی بھی اچھے واقعات اس مہینہ میں رونما ہوئے اس سے اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے مثلاً اسی ماہ میں عزوۂ خیبر پیش آیا جس میں صرف ان لوگوں کو شرکت کی اجازت ملی تھی جو صلح حدیبیہ میں شریک رہے اور جن سے مغانم کثیرہ اور فتح مبین کا وعدہ کیا گیا تھا اسی غزوہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کو آزاد فرمایا تھا اور اپنی زوجیت میں داخل فرمایا کر" یا نساء النبی لستن کاحد من النساء" یعنی اے نبی کی بیویو! تم سارے جہان کی عورتوں میں بیمثال ہو"۔ جیسی نعمت عظمیٰ سے نوازا اور اہل بیت کی نعمت سے مالامال فرمایا اور بعض کہتے ہیں کہ غزوہ ذات الرقاع بھی اسی ماہ میں پیش آیا۔ اور اسی ماہ میں حضورؐ نے اپنے چھ قاصدوں کو دعوت و سلام کے خطوط دیکر اطراف و جوانب کے ملوک و سلاطین کے پاس بھیجا تھا، اور اسی ماہ مبارک ۹ھ میں فریضۂ حج و زکوٰۃ کے تمام قوانین کی ترتیب دی گئی اور اس کے وصولی کے لئے عمال اور محصلوں کا تقرر ہوا، اور باقاعدہ بیت المال کی صورت وجود میں آئی۔ اور یہی وہ مبارک مہینہ ہے جو اسلامی سن کا پہلا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی ماہ ۲۳ھ میں حضرت عمرؓ کی شہادت باسعادت کے بعد پانچ محرم الحرام کو حضرت عثمان غنیؓ رضہ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے اور آپؓ کے سر مبارک پر تاج خلافت رکھا گیا اور تو محرم کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان حضرت آدمؑ کا پتلہ تیار کیا تھا اور اسی دن حضرت آدمؑ کی ایک لمبی مدت کے بعد توبہ قبول ہوئی تھی اور محرم کی نویں تاریخ کو حضرت نوحؑ کی کشتی جودی پہاڑ پر اتری تھی، حضرت یونسؑ کی توبہ بھی اسی ۹ محرم کو قبول ہوئی تھی، حضرت ابراہیمؑ اسی دن پیدا ہوئے تھے اور دن ان کو نار نمرود سے نجات ملی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ۹ محرم ہی کو بنی اسرائیل فرعون کے پنجۂ ظلم سے نجات پائی تھی، اسی طرح کے اور بہت سے واقعات اس ماہ مبارک میں پیش آئے ہیں جس سے اسکی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یوں تو اس مہینہ کا ہر دن بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن باقی اور دنوں کے مقابلہ میں اس ماہ مبارک کی ۹ تاریخ جس کو یوم عاشورہ کے نام سے جانا جاتا ہے بڑی اہمیت اور فضیلت حاصل ہے۔ کچھ تو آپ مذکورہ عبارتوں سے معلوم ہی ہو گیا کہ محرم کی ۹ ہی تاریخ کو سن لیں چاہے جو بھی رہے ہوں بہت سے بڑے بڑے اور اہم واقعات پیش آئے ہیں، منجملہ اس کی اور فضیلتوں اور اہمیتوں کے اس ماہ کی نو تاریخ جس کو ہم یوم عاشورہ عربی میں کہتے ہیں ایک سب سے اہم اور بڑی قابل عمل اہمیت اور فضیلت یہ ہے کہ اس دن روزہ رکھنے کا تو اب یہ منجانب اللہ پاک اپنے بندے کی ایک سال کے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے، آنحضرتؐ نے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت حفصہؓ سے مروی ہے وہ کہتی ہیں کہ چار چیزیں ہیں جن کو حضور پاکؐ نے کبھی بھی ترک نہیں فرمایا، ان میں سے پہلا عاشورہ کا روزہ ہے (۲) عشرہ ذی الحجہ یعنی ذی الحجہ کی ایک تاریخ سے لے کر ۹ ذی الحجہ تک کے روزے (۳) ہر ماہ میں تین روزے (۴) قبل فجر کی دو رکعتیں۔

اوپر جیسا کہ حضرت حفصہؓ کی روایت سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے کبھی یوم عاشورہ کے روزے کو ترک نہیں فرمایا، تو نہ صرف آپؐ رکھتے تھے بلکہ اس کا برابر اہتمام بھی فرماتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ جب حضور پاکؐ مکہ معظمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کو آپ نے یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے دیکھا تو آپؐ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا خاص دن ہے اور اس کی کیا خصوصیت اور اہمیت ہے کہ تم اس دن کا روزہ رکھتے ہو تو ان لوگوں نے کہا کہ یہ ہمارے یہاں بڑی عظمت کا دن ہے اس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کو نجات دی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرقاب کیا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے اس عظیم انعام کے شکریہ میں اس دن کا روزہ رکھا تھا اس لئے ہم بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے پیغمبر حضرت موسیٰ سے ہمارا تعلق تم سے زیادہ ہے اور ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی روزہ رکھا اور امت کو بھی حکم فرمایا کہ وہ یوم عاشورہ کا روزہ رکھیں۔

اصل بات یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یوم عاشورہ کو قریش مکہ کے نزدیک بڑی